رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

نگار

اس پرچے کی قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول ہے

قواعد رسالہ "نگار"

۱- رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے -
۲- رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
۳- خط کتابت کیوقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیے جسپر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کر دیے جاتے ہیں
۴- جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے -
۵- مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہییں -
۶- سالانہ قیمت پانچ روپیہ - ششماہی تین روپیہ - بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے -

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے -

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

چوتھائی قیمت پیشگی آنی لازم ہے

مولانا نذیر احمد		مولانا شبلی				مضامین عالمگیر		رتن ناتھ سرشار			
نبات النعش	۹/	سیرۃ النبی جلد اول	عہ	علم الکلام	۱۲/	مضامین عالمگیر	۸/	سیر کہسار	۱۲/	پیاری دنیا	۸/
مراۃ العروس	۱۰/	″ دوم	۱۲/	الکلام	۱۲/	آغاز اسلام	۸/	خدائی فوجدار	۱۲/	کایا پلٹ	۸/
توبۃ النصوح	۱۲/	″ سوم	عہ	رسائل شبلی	۸/	کلیات فارسی	۱۲/	جام سرشار	۱۲/	میٹھی چھری	۶/
موعظہ حسنہ	۸/	الفاروق	۱۲/	مقالات شبلی	عہ/	کلام شبلی اردو	۸/	الف لیلہ بطرز ناول	عہ/	طرحدار لونڈی	عہ/
رویائے صادقہ	۸/	سیرۃ النعمان	۸/	شعر العجم جلد اول	سے/	**امیر مینائی**		کامنی	۸/	طلسمی فانوس	۱۲/
ایامیٰ	۸/	الغزالی	۸/	″ دوم	۱۲/	صنم خانہ عشق	۱۲/	سوانح عمر و عیار	۸/	**جوالا پرشاد برق**	
فسانۂ مبتلا	۸/	المامون	۸/	″ سوم	۱۲/	مراۃ الغیب	۸/	**منشی سجاد حسین مرحوم**		مرنالنی	۱۲/
ابن الوقت	۸/	سوانح مولانا روم	۱۲/	″ چہارم	سے/	محامد خاتم النبیین	۸/	احمق الذی	۸/	مار آستین	۱۲/
مصائب غدر	۱۲/	سفرنامہ مصر و شام	۱۲/	″ پنجم	۱۲/	ضیائے سخن	عہ/	حاجی بغلول	۸/	بنگالی دلہن	۱۲/
				موازنہ انیس و دبیر	سے/	مکاتیب امیر مینائی	۱۲/			معشوق فرنگ	۱۲/

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴
جلد ۱۵ - شمارہ ۲

اللہ اکبر

نگار

فہرست مضامین فروری سنہ ۱۹۲۹ء

ملاحظات ــــــــ ۲
آہو (افسانہ) ذوقی بی۔ اے ۹
فلسفۂ مذہب سید مقبول احمد بی۔ اے ۲۳
لاٹری کا روپیہ (افسانہ) افسر میرٹھی ۳۷
انعام اللہ خاں یقین عرش فاردقی ۴۰
حالات عرفی پر ایک نظر فضل حسین تبسم ۵۲
خزینۂ حسن و عشق پروفیسر احتشام علی ام۔ اس سی ۵۵
حضرت نصیر الدین محمود گنج معانی ناظر دہلوی ۵۷۰
تاریخ عرب کی ایک داستان جمیل نیاز
عالم فطرت، ماورائے علم و ادراک نیاز
لفظ حسین کے ساتھ امامت کی نسبت احترام و عزت کا غلط معیار ہے۔ نیاز

منظومات :۔
نشاط بہار حافظ غازی پوری ۸۱
خدائے محبت سے روش صدیقی ۸۲
گونڈہ کی یاد ذوقی ۸۳
ترانۂ دل امین حزیں ۸۴
عورت فضل حسین تبسم ۸۵
غزلیات :۔
اثر رامپوری و شوق مرادآبادی ۸۶
اختر شیرانی و دل شاہجہانپوری ۸۷
فرخ بنارسی و راز رامپوری ۸۸
باب الاستفسار ۸۹
اقتباسات علمیہ ۹۳
مطبوعات جدیدہ ۹۴-۹۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

ایڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

شمارہ ۲	فروری سنہ ۱۹۲۹ء	جلد ۱۵

ملاحظات

گذشتہ ماہ (جنوری) کے رسالہ سے نگار نے اپنی عمر کے آٹھویں سال میں قدم رکھا ہے، جو عورتوں کی اصطلاح میں "میٹھا سال" کہلاتا ہے اور بہت "اللہ آمین" کے ساتھ بسر ہوتا ہے لیکن چونکہ ہندوستان کی محدود حوصلہ اور ناپایدار عمر رکھنے والی علمی دنیا میں کسی رسالہ یا اخبار کیلئے اس عمر تک پہونچ جانا بھی گویا "ہفت خواں" کا طے کر لینا ہے، اس لئے میں تو یہی کہونگا کہ نگار نہ صرف اپنے شباب بلکہ سنِ وقوف کو پہونچ گیا ہے اور وہ اعتماد و وقار جو ملک کے اندر اسنے حاصل کر لیا ہے، بڑی حد تک اس کی حیات طویل کا ضامن ہے اگر بدقسمتی سے کوئی حادثہ سنگِ راہ نہ ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ نگار اس وقت یوپی کے تمام اردو رسائل و جرائد سے زیادہ اشاعت رکھنے کا مدعی ہے، لیکن یہ کثرت صرف تقابلی و امتیازی ہے، حقیقی نہیں۔ یعنی یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت اسکی اشاعت مقابلۃً دوسرے رسائل سے زیادہ ہے، لیکن جس وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ حقیقۃً اسکی اشاعت کتنی ہونا چاہئے، تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ؎

وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرت تعمیر سو ہے

یہ صحیح ہے کہ رسالہ نگار نہ صرف اپنے مصارف پورے کرتا ہے بلکہ وہ میرے اسباب معیشت و معاشرت کا بھی بڑی حد تک کفیل ہے، اور ایک مشین پریس بھی مع تمام ضروری سامان کے اپنی ملکیت میں رکھتا ہے، لیکن کیا میری سات سال کی کاوش دماغ کا صرف یہی صلہ ہونا چاہئے

ممکن ہے کہ ہندوستان میں جہاں اب سرمایۂ زر و سیم کے مقابلہ میں سرمایۂ دماغ کی کوئی اہمیت نہیں، اسکو کافی سمجھا جائے، لیکن یہی سرزمین ہند پر ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جب علم و ہنر کی قدردانی کا مفہوم مادی نقطۂ نظر سے استعارۃً نہیں بلکہ حقیقتاً زر و سیم کے برابر تولا یا جانا اور زر و جواہر سے منہ بھر دیا جانا ہوا کرتا تھا۔ ہرچند میں ان لوگوں میں نہیں کہ کسی وقت اس احترام کا مطالبہ کر سکتا، لیکن خدمت کے لحاظ سے اجرت طلب کرنا یقیناً میرا فطری حق ہے اور اگر اسمیں ملک کمی کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ میں اس کا تقاضہ نہ کروں۔

نگار نے گذشتہ سال کے اندر جو خدمت زبان و علم کی انجام دی ہے یا جو ذہنی انقلاب اسنے پیدا کر دیا ہے، وہ صحافت کی دنیا کا ایسا معمولی واقعہ نہیں ہے، جس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ احباب نکتہ سنج نے اپنے اعتراف سے اور ارباب حسود نے اپنے اضطراب سے بارہا اسکو تسلیم کیا اور کرتے رہینگے لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک نگار اپنے پیغام کی نشر و اشاعت ضروری حد تک بھی نہیں کر سکا اور یہ فرض ابتک ناتمام حالت میں پڑا ہوا ہے جبکا بڑا ذمہ دار ملک ہے۔ اگر آج نگار کے تمام موجودہ خریدار صرف ایک شخص اپنا ہمخیال و ہمنوا پیدا کر کے نگار کی اعانت پر آمادہ کر دیں، (جو ایسا دشوار امر نہیں ہے) تو ایک ہی سال کے اندر ایسا صوری و معنوی انقلاب نگار کی حالت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ اسوقت آپ اسکا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

بہرحال میرا فرض اس اظہار خیال پر ختم ہو جاتا ہے اور اب مجھے دیکھنا ہے کہ ناظرین نگار کس حد تک میری اعانت کرتے ہیں۔

میں بے انتہا ممنون ہوں ان احباب کا جو وقتاً فوقتاً نگار کی توسیع اشاعت میں حصہ لیتے رہتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ مولوی غلام ربانی عزیز (کیمبل پور) کا جنہوں نے ایک ایک وقت میں پچیس پچیس خریدار فراہم کئے۔

گذشتہ ماہ نگار چونکہ سال کا پہلا پرچہ تھا اور زیادہ ضخیم نکالنا تھا اس لئے اس مرتبہ سنہ ۲۲ء کے خاص خاص مضامین کا انتخاب اس میں درج کیا گیا۔ اس سے ایک طرف یہ مقصود تھا کہ لوگوں کے پاس سنہ ۲۲ء کا ایک منتخب مجموعۂ مضامین پہونچ جائے، اور دوسری طرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ ابتدا میں جب نگار جاری ہوا ہے تو ادارت پر اس کی ترتیب کا کتنا بار تھا۔ چونکہ موجودہ خریداروں میں بہت کم تعداد ان لوگوں کی ہے جو شروع سے خریدار ہوئے ہیں اس لئے یہ مجموعۂ مضامین بہت زیادہ پسند کیا گیا۔ بعض حضرات نے جنکے پاس سنہ ۲۲ء کا مکمل فایل تھا ان کو شکایت بھی ہوئی، لیکن انکی خدمت میں عذر پیش کر دیا گیا۔

یہ امر اس سے قبل بھی ظاہر کیا جا چکا ہے اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ نگار کا نہ کوئی خاص نمبر نکلتا ہے اور نہ اسکا کوئی سالنامہ شائع ہوتا ہے، البتہ کبھی کبھی بغیر کسی التزام و تعیین کے ضخامت زیادہ کر دی جاتی ہے اور اس زیادتی حجم سے یہ فایدہ اٹھایا جاتا ہے کہ رسالہ کا اسلوب ترتیب ایک ماہ کے لئے بدلکر کچھ تنوع پیدا کر دیا جاتا ہے اس لئے اگر کوئی صاحب نگار کی کسی ایسی مخصوص اشاعت کو سالنامہ وغیرہ کے لفظ سے یاد کرتے ہیں تو اسکی ذمہ داری انہیں پر ہے۔

میں اس کا معترف ہوں کہ پنجاب کے رسایل کی طرح نہ نگار میں تصاویر ہوتی ہیں اور نہ کوئی ظاہری صنعت و نمایش اس میں پائی جاتی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جو طبیعتیں نگار کے مضامین کی عادی ہو گئی ہیں۔ وہ تصاویر اور نقش و نگار سے زیادہ کسی اور چیز کی جستجو میں رہتی ہیں اور غالباً اسکا فقدان نگار میں کبھی نہیں ہوا۔

اس میں کلام نہیں کہ رسایل میں موزوں و مناسب تصاویر کی اشاعت کے ساتھ ساتھ معقول و سنجیدہ ترتیب کا بھی لحاظ رہے، تو بہت زیادہ قابل تعریف امر ہے، لیکن عام طور پر تصاویر شایع کرنیوالے رسایل اس کا لحاظ نہیں کرتے اور صرف ظاہری صورت کا سودا کرنا چاہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس میں کامیابی نہیں ہوتی، ہوتی ہے اور بہت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ دنیا معنی سے زیادہ صورت کو کیفیت سے زیادہ کمیت کو دیکھتی ہے، لیکن یہ کامیابی تجارت کی ہے، رسالہ کی نہیں .... تصاویر کی اشاعت کا مسئلہ عرصہ سے نگار کے سامنے ہے، لیکن افسوس ہے کہ اسوقت تک نگار کی مالی حالت اس قابل نہیں ہوئی کہ وہ اسی معیار کی تصاویر شایع کر سکے جو اس کے مضامین کا ہے۔

پنجاب میں اس وقت متعدد رسایل ایسے نکل رہے ہیں جن میں تصاویر کا التزام ہوتا ہے اور میں انکے مساعی کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، لیکن جس وقت یہ غور کرتا ہوں کہ تصاویر نکالدینے کے بعد کونسا رسالہ دیکھے جانے کے قابل ہے تو صرف دو یا تین رسالے اس قابل نظر آتے ہیں۔

رسالہ ہمایوں اور نگار کی ابتدا ساتھ ساتھ ہوئی جس طرح نگار نے ایک روش قایم کرنے کے بعد اسکو ترک نہیں کیا، اسی طرح ہمایوں نے بھی اپنا سمت مقصود نہیں بدلا۔ بلکہ اس کو یہ امتیاز اور زیادہ حاصل ہے کہ وہ تصاویر بھی شائع کرتا رہتا ہے جن میں سے اکثر اچھے ذوق کا پتہ دیتی ہیں، نیرنگ خیال، ہمایوں کے بعد جاری ہوا، لیکن تصاویر کی ابتدا اسی نے کی اور غالباً اخفاء حقیقت ہوگا اگر یہ نہ کہا جائے کہ دیگر رسایل کے مصور شائع ہونے کا سبب نیرنگ خیال ہی ہوا۔ اسی نے خصوصیت کے ساتھ مخصوص نمبروں اور سالناموں پر زیادہ توجہ کی اور آج غالباً اس سے زیادہ کامیاب رسالہ اس باب میں کوئی نہیں اور جن اصول کے ماتحت اسکو جاری کیا گیا تھا اس میں اسکو قابل رشک کامیابی حاصل ہوئی۔ رسالہ مخزن کا نشارۃ الثانیہ نیرنگ خیال کے بعد ہوا اور جناب حفیظ جالندھری کی سعی و کوشش سے اس نے بھی کافی ترقی کی تصاویر بھی اچھی اچھی شائع ہوئیں اور ترتیب و تہذیب میں بھی دلکشی پیدا ہوگئی، لیکن ایک عجیب و غریب بات جو پنجاب کے رسایل و جرائد میں پائی جاتی ہے اور جس سے ہمایوں بھی باوجود اپنی انتہائی متانت و سنجیدگی کے نہ بچ سکا، وہ باہمی تضحیک و توہین اور سب و شتم ہے۔ خیر اگر پنجاب کے رسالے یوپی کے رسایل کے مخالف ہوں تو اسکی تاویل بھی ہو سکتی ہے، لیکن خود اُن کا آپس میں افتراق و انشقاق عجیب بات ہے۔

اسی سلسلہ میں مجھے وہاں کے ایک اور نوزائیدہ رسالہ کا ذکر ناضروری ہے جو شبستان کے نام سے دیوان آتم آنند شرما بی اے کی ادارت میں جنوری سنہ ۲۹ء سے جاری ہوا ہے۔ یہ رسالہ سینما کی دنیا سے متعلق ہے اور اس میں صرف وہی مضامین درج ہونگے جو "بالواسطہ یا بلاواسطہ" سینما سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس رسالے میں دنیا کے بعض مشہور ایکٹروں کی تصاویر بھی ہیں اور طباعت، کتابت اور کاغذ نہایت ہی عمدہ و پاکیزہ ہے۔ جناب پطرس کا مضمون "فلم کی شام" دیکھنے کے قابل ہے۔

سیاسیات ہند کا سب سے زیادہ مہتم بالشان مسئلہ جسے گذشتہ کانگرس کی تمام کاروائیوں کا ماحصل کہنا چاہیے، ہندوستان کیلئے ڈومینین ہوم رول کا مطالبہ تھا جسکی سفارش نہرو کمیٹی رپورٹ میں کی گئی تھی اور جس سے انڈیپنڈنٹ پارٹی کو سخت اختلاف تھا۔ میں اس جگہ کانگرس کی کاروائیوں کو بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتا، کیونکہ اسکا علم ہر اخبار بین شخص کو ہے، لیکن مختصراً یہ ظاہر کرنا ضروری ہے

کہ گذشتہ کانگرس کے بعد سیاسیات ہند کا رخ کیا ہو گیا اور مسلمانوں نے اس سے کس حد تک فایدہ اٹھایا۔

مہاتما گاندھی کا چند سال سے پانوں توڑ کر زاویہ نشین ہو جانا اور پھر دفعۃً کانگرس میں شریک ہو کر تجدید عمل کی نمایش کرنا اور وہ بھی اس شان کے ساتھ کہ کانگرس میں ہر جگہ وہ پنڈت موتی لال نہرو ہی کے حلقوم سے گفتگو کر رہے ہوں اور آزادی کامل کے مطالبہ سے اتر کر ڈومینین ہوم رول تک آ جائیں، کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتی،

میں دیکھتا ہوں کہ یہ ڈرامہ جو کانگرس کے اجلاس پر کھیلا گیا، اسکی طیاری مخفی طور پر الہ آباد اور احمد آباد میں بہت عرصہ سے ہو رہی تھی یہاں تک کہ مجھے تو یہ شبہ ہے کہ انڈیپنڈنٹ جماعت کی وہ شدید مخالفت جو کانگرس میں ظاہر ہوئی، کہیں وہ بھی اسی کھیل کا کوئی طے شدہ اور مقررہ حصہ نہو۔

بہر حال حقیقت جو کچھ بھی رہی ہو اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ کس حد تک صحیح ہے اور اس سے کن نتائج کی توقع کی جاتی ہے۔ گذشتہ کانگرس کی اس متفق علیہ آواز کو کہ "اگر ہوم رول ایک سال کے اندر نہ ملگیا تو عدم تعاون، ستیاگرہ وغیرہ کے وہی حربے اختیار کئے جائیں گے جن کی اس قبل آزمایش ہو چکی ہے" بلا اختلاف تمام جماعتوں نے پسند کیا اور کم از کم ایک سال کے لئے ہندوستان کے سیاسیات کا ایک متفقہ محاذ قایم ہو گیا۔

یہ تجویز حقیقتاً ایک کھلا ہوا پیام جنگ ہے جو حکومت برطانیہ کو دیا گیا ہے اور اگر اس چیلنج کے الفاظ کو واقعۃً عمل سے بھی ثابت کر دیا گیا تو پھر ہندوستان کا کم از کم اس منزل سے گزر جانا تو یقینی ہے، جسے سکون جمود کہتے ہیں، رہا نتیجہ، سو اس کی جستجو بیکار ہے، کیونکہ جب انسان طوفان میں گھر کر ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور ہو جاتا ہے تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ساحل ملگیا، اور اس امید پر تو اس سے زیادہ قربانی کی جا سکتی ہے۔

مسلمانوں میں باہم جو اختلاف اس مسئلہ میں پیدا ہو گیا ہے، وہ البتہ بدستور قایم ہے اور اگر سنہ ۲۹ء کے اخیر تک حکومت برطانیہ کے کسی فیصلہ نے ملک کے اندر کوئی عام اضطراب نہ پیدا کر دیا، تو اس خلیج کا وسیع ہو جانا بالکل یقینی ہے، اور کمزور جماعت ہونے کے لحاظ سے خسارہ میں رہنا لازمی۔

مسلم لیگ کے جو جلسے کلکتہ میں ہوئے ان کو کانگرس ہی کا پرتو سمجھنا چاہئے، کیونکہ، ہمیں حصہ لینے والے مسلمان تقریباً سب وہی تھے جو شروع سے نہرو کمیٹی رپورٹ کے موافق ہیں۔ مخالفین کی شرکت وہاں کی فضا میں کوئی تغیر پیدا نہ کر سکی بلکہ انکا رہا سہا اقتدار بھی ختم ہو گیا۔ اس کے جواب میں دہلی کی آل مسلم پارٹیز کانفرنس کا انعقاد جو اہمیت رکھ سکتا تھا اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ پذیرائی کرنے والے کون تھے اور جن کی پذیرائی کی گئی وہ کیا ہیں۔ اس کانفرنس نے کوئی قابل ذکر اہمیت پیدا نہیں کی اور نہ جمہور مسلمانان ہند کے خیالات میں اس سے کوئی تغیر پیدا ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ وقت بہت دلچسپ ہو گا جب اس اختلاف کے بانی (خواہ وہ اختلاف کتنے ہی خلوص پر کیوں نہ قایم ہو) مجبور ہو کر ترک اختلاف کا عہد و پیمان کریں گے اور ہندو سبھا کے حکم کو، برطانیہ کے حکم پر ترجیح دینا باعث فلاح سمجھیں گے۔

کانگرس میں مہاتما گاندھی کے اس الٹی میٹم کے شایع ہوتے ہی ملک و بیرون ملک کے معزز ارکان صحافت نے جن جن خیالات کا اظہار کیا وہ بہت امید افزا تھا اور ہم کو ماننا پڑے گا کہ لارڈ ارونگ کی تقریر افتتاح کونسل کے وقت بڑی حد تک انہیں خیالات و آراء سے متاثر

ہونے کے بعد تب کی گئی تھی۔ گاندھی کے چیلنج کا جواب جس سکون و نرمی کے ساتھ حکومت ہند نے دیا ہے وہ برطانوی ڈپلومیسی کا کوئی جدید مظاہرہ نہیں ہے۔ کیونکہ "مجاہا سر بایدانداختن" کے اصول سے کام لینے کو جیسا یہ قوم جانتی ہے کسی اور قوم کو نہیں معلوم، لیکن اسی کے ساتھ نتیجہ کے لحاظ سے جو مایوسی پیدا کر دی ہے، وہ لندن کے قلمدان وزارت کا کوئی نیا کارنامہ نہیں جس کے نقوش پر ویسرائے ہند کے آواز کی رکارڈ تک ہوتی ہے۔

بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ سنہ ۲۹ء کے اخیر تک، حکومت کی طرف سے علاوہ سائمن کمیشن کے کسی اور کمیشن کا وجود عمل میں آئے گا جس کو اہل ہند بائیکاٹ نہ کر سکیں گے اور اگر سائمن کمیشن اور اس دوسرے کمیشن کے فیصلہ میں اختلاف ہوا جو بالکل یقینی ہے تو پھر کسی تیسرے کمیشن کو پیدا کیا جائے گا جو زیادہ تر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی حیثیت رکھیگی اور اس طرح کم از کم آٹھ دس سال کا زمانہ گزر جائے گا اور گاندھی جی تذبذب حالت میں بیٹھے ہوئے یہی سوچتے رہیں گے کہ انہیں اپنے ترکش کا کوئی تیر استعمال کرنا مناسب ہے یا نہیں ؟

اس لئے میری رائے میں یہ زمانہ صرف انتظار میں بسر کر دینا کہ حکومت کیا فیصلہ کرتی ہے اور سنہ ۳۰ء میں ہمیں کیا کرنا ہے، تضیع اوقات ہے۔ اس دوران میں سب سے پہلے یہاں کی اقتصادیات و معاشیات پر قابو حاصل کرنے کیلئے ایک نہایت زبردست مرکزیت پیدا کرنا چاہئے اور کوشش کر کے ملک کو بتا دینا چاہئے کہ انکی فلاح کا انحصار صرف اقتصادی اصلاح پر ہے جس کی اولین منزل کھدر کا استعمال ہے۔ ملک کی آزادی کا سوال سامنے رکھکر کھدر کے استعمال کی ترغیب کبھی مفید نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ابھی تک عوام ملک کی آزادی کی اہمیت کو نہیں سمجھتے، بلکہ لوگوں کو دلایل سے، اعداد و شمار سے یہ بتانا چاہئے کہ کھدر کا استعمال کتنوں کے قرضے ادا کر سکتا ہے، کتنی جائدادوں کا فک رہن اس کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔ کتنے خاندان فاقوں سے بچ سکتے ہیں اور کتنے بچے تعلیم پا سکتے ہیں۔ کھدر پرچار میں ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ بھی سیاسیات کا نہ آنا چاہئے، بلکہ اس کو صرف اقتصادی مسئلہ کی حیثیت سے رائج کرنا چاہئے، جس کے لئے اگر نیشنل کانگرس اپنی کوئی علحدہ شاخ قایم نہیں کر سکتی تو ایک اقتصادی کانگرس بالکل جداگانہ قایم کرنا چاہئے اور تمام اکابر قوم کو کم از کم دو تین سال کے لئے اپنی ساری توجہ اسی طرف مبذول کر دینا چاہئے۔

مہاتما گاندھی نے اب پھر ایک جدید اسکیم اس مسئلہ کی شائع کی ہے، لیکن صرف اسکیموں کی اشاعت سے کچھ نہیں ہو سکتا جب تک کچھ عرصہ کے لئے تمام اور تحریکوں سے قطع نظر کر کے تمام اکابر ملک کی توجہ اس طرف مبذول نہ ہو۔ کیونکہ یہ تحریک اسوقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک ایک ایک گانوں پھر کر اس کا پروپگنڈا نہ کیا جائے اور نہایت وسیع پیمانہ پر تجارت اور کاروبار کی صورت سے اسکی اشاعت نہو۔

بیرون ہند کے معاملات میں سب سے زیادہ اہم واقعہ انقلاب افغانستان کا ہے کہ ایک بغاوت نے جو پہلے بہت معمولی معلوم ہوتی تھی یہانتک اہمیت اختیار کر لی کہ امیر امان اللہ خان کو سلطنت چھوڑ کر کابل سے قندہار آنا پڑا اور سردار عنایت اللہ خاں بھی کامیاب باغیوں کی وجہ سے کابل میں نہ رہ سکے۔ اس انقلاب کے تمام واقعات و جزئیات سے ہر شخص واقف ہے اور شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس نے شروع سے اس وقت تک اس تغیر کے مختلف مدارج و منازل کا مطالعہ اخباروں کے ذریعہ سے نہ کیا ہو۔ لیکن سب سے زیادہ حیرتناک امر یہ ہے کہ باوجود افغانستان کے اس قدر قریب ہونے کے آجتک کوئی خبر ایسی موصول نہیں ہوئی جسپر ایکدن کیلئے بھی وثوق ہو سکے اور دوسرے دن اسکی تردید کی توقع نہ ہوتی ہو۔

یہ انقلاب وہاں کیوں رونما ہوا، اور اس نے اسقدر شدت کیوں اختیار کی، کوئی ایسا راز نہیں ہے جس کی حقیقت معلوم کرنے کیلئے زیادہ انتظار کیا جائے۔ اس انقلاب کے اسباب متعدد بیان کئے جاتے ہیں جنمیں سب سے زیادہ اہم ایک سبب یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ امان اللہ خاں کی مغربی اصلاح وہاں کے تاریک خیال لوگوں کو ناگوار گزری، دوسرا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حکومت برطانیہ نے اس بغاوت کو پیدا کیا تاکہ امان اللہ خاں جو روسیوں کے زیادہ طرفدار تھے علیحدہ ہو جائیں" ان میں سے دوسرا سبب تو یقیناً قابل اعتماد نہیں ہو سکتا، کیونکہ نہ امیر امان اللہ خاں روسیوں کے طرفدار تھے اور نہ وہ ہو سکتے تھے جبکہ روس کی موجودہ حالت ہرگز ایسی نہیں کہ اسکی موافقت میں کوئی سلطنت، دوسرے ملک کی مخالفت مول لیکر روس سے امداد کی توقع رکھے۔ اگر آج روس اس قابل ہوتا تو موجودہ انقلاب افغانستان سے وہی سب سے زیادہ ناجایز فایدہ اٹھاتا۔ علاوہ اس کے سرحدی سیاست کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ حکومت ہند کا فایدہ اسمیں ہے کہ افغانستان کے اندر کوئی مرکزی حکومت قایم رہے اور تفریق و انشقاق نہ پیدا ہو، کیونکہ اس صورت میں اسکی خارجی پیچیدگیاں اور بڑھ جائیں گی۔ بہرحال یہ خیال لوگوں کا برنبائے غلط فہمی ہے۔

سبب اول کی کچھ حقیقت ضرور ہے، لیکن نہ اسقدر کہ اسی کو اصل وجہ قرار دیا جائے۔ مینے جہانتک غور کیا ہے اسکا سب سے بڑا سبب افغانستان کی عام اقتصادی حالت کا کمزور ہو جانا ہے اور اس کے بعد دوسرا سبب وہاں کے عمال کا ناقابل ہونا۔ امان اللہ خاں جس عزم و ثبات جس مستعدی اور برق وشی کے ساتھ اصلاحات کو نافذ کر رہے تھے اسکا اقتضاء یہ بھی تھا کہ رعایا پر ٹیکس بڑھا دیا جائے اور اسے وصول بھی کیا جائے، پھر چونکہ افغانستان کی رعایا جو پہلے محاصل زمین بھی صرف غلہ کی صورت میں ادا کیا کرتی تھی اور جو حقیقتاً مفلس و نادار ہے، حکومت کے جدید ٹیکسوں سے گھبرا گئی اور یہ دیکھکر کہ ابھی تو ابتدا ہے آیندہ خدا جانے اور کیا کیا دینا پڑے ان میں بددلی پیدا ہو چلی تھی، پھر چونکہ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ وہاں کے عمال اچھے نہیں ہیں (اور نہ اسقدر جلد تمام ملک کے اہلکاروں کی اصلاح ہو سکتی ہے) اس لئے وہ پبلک کی بدظنی کم کرنے کے بجائے اور زیادتی کا باعث ہوئے اور رفتہ رفتہ یہ آگ تمام اکناف ملک میں مشتعل ہو گئی، اور وہ تمام لوگ جو کچھ ان اسباب کی بناء پر اور کچھ دیگر قبائلی و نسلی تفریق و عناد کی بناء پر پہلے ہی سے خوش نہ تھے ملکر اس ہنگامہ کا باعث ہو گئے۔

پردہ کا مسئلہ، عورتوں کی تعلیم، لباس کی تبدیلی، ان میں سے کوئی بات ایسی نہ تھی جو برہمی کو اس حد تک پہونچا دیتی، اگر اسوقت کابل کا خزانہ ملک کی اقتصادی حالت کو درست کرنیکا اہل ہوتا، محض جبریہ فوجی بھرتی کی مخالفت افغانستان میں کبھی نہیں ہو سکتی (کیونکہ جنگ انکی فطرت ہے) لیکن اگر فوج کو تنخواہ وقت پر نہ ملے تو بیشک اسکو بددل ہونا چاہئے اور یقیناً یہ بھی ایک سبب باغیوں کی کامیابی کا ہوا اور شاہی فوج پوری قوت کے ساتھ مقابل نہیں آئی۔ ممکن ہے کہ وہاں کے وزراء کا باہم شکر رنجی نے بھی اس شورش کی اعانت کی ہو۔ بہرحال اسوقت وہاں کی حالت یہ ہے کہ مختلف حصوں پر مختلف شخصوں نے حسب موقعہ قبضہ جما رکھا ہے اور امان اللہ خاں نے پھر اپنی ملوکیت کا اعلان کر کے بچہ سقہ کے خلاف جو کابل پر قابض ہو گیا ہے، تاخت کی تدبیریں شروع کر دی ہیں۔ آیندہ کیا ہوگا۔ اس کے متعلق بھی آسانی سے پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ افغانستان ان ملکوں میں سے ہے جہاں نہایت آسانی سے طوائف الملوکی پیدا ہو سکتی ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت واضح ہے کہ اسوقت سوائے امان اللہ خاں کے اور کوئی شخص سارے ملک میں ایسا نہیں ہے جسکی حکومت پر تمام قبائل کسی وقت متفق ہو سکیں۔

امان اللہ خاں کا شاہی خاندان سے ہونا، اپنی خصوصیات ذاتی کی بنا پر صاحب اثر و اقتدار ہونا اور گذشتہ طرزِ عمل سے انکا سچا خادمِ ملک ثابت ہو جانا، یہ تمام وہ باتیں ہیں جنکا اثر ابتک قایم ہے اور رہے گا، اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ ملک دوبارہ انکی حکومت و سیادت کو تسلیم نہ کرے، لیکن ضرورت یہ ہے کہ پہلے اس ہنگامی اشتعال کو فرو کر دیا جائے۔ اسوقت تک امان اللہ خاں کا قندھار میں خاموش بیٹھا رہنا اس لئے نہیں ہے کہ وہ آیندہ کیلئے مایوس ہو چکے ہیں یا انہیں افغانستان کی موجودہ تشتت و انتشار سے کوئی تکلیف نہیں پہونچ رہی ہے، بلکہ اسکا سبب صرف موسم کی خرابی ہے۔ جسوقت برفباری موقوف ہو کر راستے صاف ہو گئے تو آپ دیکھیں گے کہ امان اللہ خاں نے کیا کیا۔ اور ہوا کا رُخ کس طرف کو پھر گیا۔ سقہ بچہ کی ذاتی حیثیت ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ وہ برفباری کے موسم سے زیادہ کابل کو اپنے پاس رکھ سکے۔ جسوقت یہ شدت سردی کی ختم ہوئی اور امان اللہ خاں کا آفتاب اقبال قندھار سے طلوع ہوا تو یہ تمام اپنی اپنی جگہ پر بادشاہ بن بیٹھنے والی ہستیاں شبنم کی طرح اڑ جائیں گی اور پھر وہ امن و سکون، عروج و ترقی کا زمانہ آئے گا جس کی تکمیل امان اللہ خاں کے ہاتھ پہ قدرت نے لکھدی ہے۔

اس زمانہ میں برطانیہ کی نیوٹرل پالیسی کو عام طور پر بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اور غالباً یہ بڑی مدد تھی جو حکومت ہند کی طرف سے پیش کیگئی لیکن یہ سوال ہے کہ جب امان اللہ خاں نے اپنی ملوکیت کا اعلان کیا تو اسکو برطانیہ نے کیوں تسلیم نہیں کیا اور ابتک سرکاری پیغامات میں انکا ذکر ایک معزول بادشاہ کی حیثیت سے کیوں کیا جاتا ہے اور کیوں نہیں اُن سے وہی تعلقات قندھار میں پیدا کئے جاتے جو اس سے قبل کابل میں تھے۔ کیا امان اللہ خاں نے باقاعدہ اسکی اطلاع حکومت ہند کو نہیں دی؟ یہ راز شاید ابھی ظاہر نہیں ہو سکتا اور نہ اسپر رائے زنی مناسب ہے۔

سب سے زیادہ باعث مسرت امر اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہندوستان کی غیر مسلم صحافت نے جسمیں اینگلو انڈین اور ہندو دونوں شامل ہیں، اپنا انداز تنقید نہایت سنجیدہ اور قابل تعریف رکھا۔ شاید ہی کوئی ایسا اخبار ہو جسنے امان اللہ خاں کیساتھ ہمدردی کا اظہار نہ کیا ہو اور اس انقلاب کو دہانگی پبلک کی غیر دانشمندانہ پالیسی پر محمول نہ کیا ہو۔ اور یہ اتنا بڑا ثبوت امان اللہ خاں کی دلعزیزی کا ہے کہ شاید ہی اب اسمیں کسی اور اضافہ کی گنجایش ہو سکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جدید اصلاحات کے نافذ کرنے میں امان اللہ خاں نے اپنی فطرت کے لحاظ سے ذرا عجلت سے کام لیا اور صرف اپنے خلوص اور خدمت قومی کے جذبہ سے متاثر ہو کر اپنی قوم کی ذہنیت کو نظر انداز کر دیا۔ اگر وہ انہیں اصلاحات کے نفاذ کیلئے ذرا نرم پالیسی سے کام لیتے اور دفعتہً تمام نظام میں تبدیلی پیدا کرنیکے خیال سے اپنے آپ کو اور ملک کو اقتصادی مشکلات میں مبتلا نہ کر لیتے تو شاید یہ انقلاب رونما نہ ہوتا۔ امید ہے کہ جب دوبارہ عنان حکومت میں لیں گے تو وہ زیادہ مصلحت اندیشی سے کام لینگے مغرب سے جہاں وہ اور اصلاحات کا درس لیکر آئے ہیں، اگر انہیں کے ساتھ وہ اس ڈپلومیسی کا بھی سبق لیتے جو انسان کی زبان و قلب کو بالکل علحدہ علحدہ کر دیتی ہے تو افغانستان کی کم از کم سیاست خارجہ کا اقتدار اسقدر جلد زایل نہ ہوتا۔

"تذکرۂ خندۂ گل" کی تکمیل میں جتنی تعویق ہوتی جاتی ہے، اتنی ہی میری شرمندگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، لیکن پہلے یہ خیال نہ تھا کہ کتاب اسقدر ضخیم ہو جائیگی۔ بہرحال امید کیا بلکہ یقین ہے کہ زیادہ سے زیادہ وسط مارچ تک کتاب مکمل ہو جائے گی اور اخیر مارچ تک تمام ان حضرات کی خدمت میں بھیجدی جائیگی جنکا روپیہ وصول ہو چکا ہے۔

نیاز

آہو

اتنی شدت کی سردی تھی کہ اونی اوورکوٹ کی جیبوں میں بھی ہاتھ گلے جا رہے تھے۔ اور ناک تو اسقدر ٹھٹھر گئی تھی کہ چہرے پر ہاتھ پھیرو تو معلوم ہوتا تھا جیسے بالکل غائب ہو گئی ہو۔ دستانوں اور جرابوں کی یہ حالت تھی کہ گرمی پہونچانے کے بجائے برف کی قاشیں معلوم ہو رہی تھیں۔

کانپور اسٹیشن کا پلیٹ فارم مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ متوسط طبقے کے وہ لوگ جو ریفرشمنٹ روم میں چائے پینے کی استطاعت نہیں رکھتے، چائے کے اسٹال کو شہد کی مکھیوں کی طرح گھیرے ہوئے تھے۔ گرم چائے سے زیادہ منھ سے بھاپیں نکل رہی تھیں۔

میں، رشید اور آزاد لوہے کے ایک ستون کے پاس سمٹے سمٹائے چمڑے کے بکسوں اور بستروں کے بے ترتیب انبار پر ڈھیر تھے۔ سردی کی وجہ سے اتنی ہمت بھی نہ پڑتی تھی کہ جیبوں میں سے ہاتھ نکالکر سگرٹ ہی سلگا لیں اور اسکے گرم دھوئیں سے ٹھٹھرے ہوئے سینوں کو حرارت پہنچائیں۔ کچھ دور چھ سات قلی زرد وردیاں پہنے ایک بڑی سی انگیٹھی کے آگے تاپ رہے تھے۔ ان سے کچھ ہٹ کر دو چار اجڈ دیہاتی موٹے موٹے کھدر کے میلے میلے لحافوں میں گٹھری بنے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ایک کے اوپر ایک لدی ہوئی چند عورتیں جگہ کی تنگی پر اس طرح چلا چلا کر لڑ رہی تھیں کہ ان کی چیخ پکار کی آواز میں رونے بچوں کا شور و غل بھی دب گیا تھا۔

میں نے ان جاہل عورتوں کی تو تو میں میں سنی تو میں سوچنے لگا کہ انسان فطرتاً تنگ دل اور لڑاکو واقع ہوا ہے۔ بے شک تعلیم اور تمدن سے بہت کچھ یہ جانور پن کم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے یہ تھوڑی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت میں شرافت اور عالی حوصلگی کے اوصاف داخل ہیں۔ یہ چیزیں تو محض ملمع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر ہمیں انسانی فطرت کا صحیح اندازہ کرنا ہے تو ان لوگوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے جنکی زندگی اس قسم کے ملمع سے محفوظ ہے۔ مثلاً ناسمجھ بچے یا ان پڑھ کندۂ ناتراش گنوار۔ ان لوگوں کو دیکھئے کیسا ذرا ذرا سی بات پر لڑنے مارنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ کیسی ہی کم قیمت چیز کیوں نہ ہو اس میں کسی دوسرے کا ہاتھ لگانا بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ دور کیوں جائیے۔ انہیں زبان دراز عورتوں پر نظر ڈالئے۔ کسی نے دوسری عورت کے بستر پر اپنی گٹھری رکھدی یا بھولے سے ایک نے دوسری کی پھٹی پرانی بدبودار چادر کے کونے پر پاؤں پھیلا دئے تو غل شور کی وہ کان پھاڑ دینے والی آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں جیسے کسی ہندوستانی بازار میں سبزی فروش چلا چلا کر ترکاری بیچ رہے ہوں۔

سلسلۂ خیال یہیں تک پہونچا تھا کہ دور سے اکسپرس کے پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ رات کی بھیگی ہوئی سرد ہوا کو چیرتی پھاڑتی

کانوں میں گونجنے لگی۔ پلیٹ فارم پر جہاں ایک لمحہ پہلے سارا مجمع دبکا دبکا یا بھیگے ہوئے پرندوں کی طرح سکڑا بیٹھا تھا، ہلچل سی مچ گئی۔ جو لوگ بیٹھے ہوئے اونگھ رہے تھے وہ بوکھلا کر لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں پر کھڑے ہو گئے۔ ایک ہی منٹ میں اسٹیشن کے اِس سرے سے اُس سرے تک زندگی کی لہر دوڑ گئی۔

گاڑی ٹھہری تو ہم لوگ بھی گرم مفلروں سے گردن اور کانوں کو لپیٹے، قلی کے سر پر اسباب رکھوائے انٹر کلاس کے ایک لمبے درجہ میں گھس پڑے۔ یہاں پہلے ہی مسافروں کی کثرت سے تل دھرنے کی جگہ باقی نہ تھی۔ لیکن۔ سردی میں اتنے حواس کسے تھے کہ درجے درجے جگہ ڈھونڈھتا پھرے۔ مجبوراً وہیں دروازے کے پاس، سامان کے پلندوں کو الٹا سیدھا، تلے اوپر رکھ کر، ہم تینوں نے اس پر اپنا اڈا جما دیا۔

کچھ تو کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے، اور کچھ مسافروں کی کثرت سے یہاں بمقابلتاً سردی کم تھی۔ رشید نے ایک کمبل کھول کر میرے کاندھوں پر ڈال دیا۔ دوسرے کمبل میں آزاد اور رشید دونوں نے شرکت کر لی۔ گاڑی چل کھڑی ہوئی۔ اب کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو میں نے چاروں طرف نظر ڈال کر اپنے ہم سفر ساتھیوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ درجہ میں کم و بیش کوئی پچیس ۲۵ مسافر بھرے ہوئے تھے جن میں دو چار کے علاوہ باقی سب اونگھ رہے تھے۔

ایک کونے میں بڑی بڑی گھنیری موچھوں اور پھولے گالوں کے ایک گول مول سیٹھ جی جن کے کپڑوں سے ہینگ اور سونٹھ کی بو آ رہی تھی، اپنا سر بند کھڑکی کے شیشے سے لگائے، منہ کھولے بیٹھے ہی بیٹھے خراٹے لے رہے تھے۔ ان کے برابر آس پاس کی نشستوں پر آڑے ترچھے، ایک کے اوپر ایک کئی بوڑھے مسافر نیم بیداری اور نیم غنودگی کی حالت میں آہستہ آہستہ کھانس رہے تھے۔ بالکل ہمارے متصل ایک دبلا پتلا خوفناک شکل کا لانبا آدمی جو طوطے کی چونچ ایسی ناک پر سنہری عینک لگائے تھا، ہر دوسرے تیسرے منٹ کھڑکی کا شیشہ گرا کر اور سر باہر نکال کر تھوکنے لگتا ہے۔

میں ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر ایک کونے سے دوسرے کونے تک دیکھ گیا۔ ہمارے سامنے والی بنچ پر ایک خوش پوش نوجوان بیٹھا سگرٹ پی رہا تھا۔ دھوئیں کے روپہلے پیچ دار لچھے آہستہ آہستہ اوپر بلند ہو کر بجلی کے لیمپ کے پاس ہوا میں تحلیل ہو جاتے میں بڑی دلچسپی سے دھوئیں کے گول حلقوں کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں نوجوان کے برابر رکھے ہوئے کپڑوں کے گٹھر کو جسے میں اب تک بقچی سمجھ رہا تھا حرکت ہوئی اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے سترہ اٹھارہ سال کی ایک خوبصورت لڑکی اپنے جسم سے سبز دلائی ہٹا کر ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ اس کے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ پپوٹے نیند کے خمار سے بھاری ہو رہے تھے۔ وہ سیاہ کنارے کی ایک سادہ سپید ساری پہنے تھی۔ اس کے ہاتھ کہنیوں تک کھلے ہوئے تھے۔

لڑکی نے نوجوان کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ "بھیا! تم ابھی تک سوئے نہیں" نوجوان نے سگرٹ کا جلا ہوا ٹکڑا نیچے پھینک کر اسے جوتے سے دباتے ہوئے جواب دیا:-

"تم اٹھ کیوں بیٹھیں؟ آرام سے لیٹی رہو۔ مجھے نیند آئے گی تو دیکھا جائے گا۔ جلدی کاہے کی ہے؟" لڑکی آہستہ سے سرک کر

ایک طرف ہو رہی۔

"نہیں بھیا۔ بس میں بہت سوئی۔ کب تک سگرٹ کے سہارے جاگو گے۔ اب تم آرام کرو" اور اس نے اپنے بھائی کی طرف ایسی نرم نگاہوں سے دیکھا جس میں محبت بھری التجا تھی۔ نوجوان کمبل تان کر لیٹ رہا۔ تھوڑی دیر میں خر خر کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ آزاد اور رشید نیند کے غلبے سے چھت کی طرف منھ کئے جھوم رہے تھے۔ درجے میں سونے والے مسافروں کے خراٹوں اور بڈھوں کے کبھی کبھی کھانسنے کی آوازوں کے علاوہ بالکل خاموشی تھی۔ لمبی ناک والا طویل القامت عقاب بھی تھوکتے تھوکتے اونگھ گیا تھا۔ کبھی کبھی پٹری کے اونچے نیچے ہونے کی وجہ سے گاڑی ایک وزنی جھٹکے کے ساتھ ہل جاتی تو بند کھڑکیوں کے تختوں اور شیشوں سے کھڑ کھڑ کی آواز آنے لگتی۔

میں نے اس لڑکی کا چہرہ اور لباس دیکھنا شروع کیا۔ اسکا رنگ نہ سانولا تھا نہ گورا۔ شاید گندمی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس قسم کا گندمی رنگ جسے قریب سے دیر تک دیکھتے رہو تو ایسا معلوم ہو کہ لحظہ بہ لحظہ کھلتا جاتا ہے۔ بالوں کا رنگ آنکھوں کی طرح بالکل سیاہ تھا۔ مانگ کچھ بنی ہوئی تھی کچھ بگڑی ہوئی۔ بالوں کا ایک باریک لچھا اپنی جگہ سے علیحدہ ہو کر صاف و شفاف رخساروں پر آپڑا تھا۔ وہ موزہ نہیں پہنے ہوئے تھی اس کے نازک پیروں میں سیاہ وارنش کا ایک خوبصورت پمپ تھا۔ جاڑوں کی خنک ہوا سے پتلے پتلے ہونٹوں پر گلابی پٹیریاں جمی ہوئی تھیں جنہیں تر کرنے کیلئے وہ ان پر بار بار اپنی سرخ زبان پھیرتی تھی۔ ماتھے پر سیندور کا یا خدا جانے کس چیز کا لال ٹیکا تھا۔ ناک میں فیروزی رنگ کی ایک چھوٹی سی خوشنما کیل تھی۔ اسکی گردن کی جلد کی تہ سے ہلکے نیلے رنگ کے ڈورے جھلک رہے تھے۔

میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا کہ اس کی لانبی پلکوں کو جنبش ہوئی اور اسکی امرت بھری نگاہیں اوپر اٹھیں۔ اس نے دیکھ لیا کہ میں آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ میں سمجھا میری نگاہوں کے بار سے وہ لجا جائے گی اور آنکھیں نیچی کر کے اپنا جسم اس طرح سمیٹ لے گی جیسے ہوا کے تیز جھونکے سے نرم گھانس بل کھا کر مڑ جاتی ہے۔ اس نے ایسا نہیں کیا۔ بغیر جھجکے، بغیر شرمائے اس نے اپنی باریک انگلیوں سے دلائی کا کنارہ پکڑ کر اسے اپنے الجھے ہوئے بالوں پر ڈال لیا اور پھر ان ننھے ننھے پردار کیڑوں کو دیکھنے لگی جو بجلی کے لیمپ کے گرد چکر کاٹ رہے تھے۔

میں نے خیال کیا یہ نادان الھڑ لڑکی ابھی اسقدر بھولی اور ناتجربہ کار ہے کہ اسے حریص نگاہوں سے جھجکنا بھی نہیں آتا۔ یہ ابھی دنیا کی گھناؤنی مکاریوں سے واقف نہیں اور انسانی چالوں سے بالکل اسی طرح بے خبر ہے جیسے کسی غیر آباد جزیرے کی جنگلی نیل گائے جسنے کبھی کسی انسان کی صورت نہ دیکھی ہو اور جو چونک کر بھاگ جانے کے بجائے بے دھڑک آدمی کے قریب آ کر کھڑی ہو جائے۔ میرا دل اس لڑکی کی ہمدردی میں پسیجنے لگا اور سانس میں دلسوزی کی گرمی پیدا ہو گئی۔

ایسی معصوم ایسی پاکیزہ دیوی کا بھائی ہونا بھی دنیا کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ نوجوان کسقدر خوش قسمت ہے جسے ایسی پیاری بہن کی بے لوث محبت حاصل ہے۔ دنیا کی تمام بے شمار دولتیں، تمام بیش بہا خزانے ایک طرف اور اس بھولی بھالی فرشتہ خصلت لڑکی کی محض ایک محبت بھری نگاہ ایک طرف۔ یہ سوچتے سوچتے میرے دل میں ایک عجیب خواہش پیدا ہوئی۔

اس نوجوان کے بجائے کاش میں اس بھولی لڑکی کا بھائی ہوتا۔ اسی طرح اپنی بہن کے ساتھ میں سردیوں کی ایک برفانی رات میں دور و دراز کا سفر کرتا۔ وہ اونگھنے لگتی تو میں اسے اپنے برابر ملائم اور گرم کمبلوں میں لپیٹ کر محبت سے سلا دیتا۔ وہ سوتی رہتی۔ میں اس کے قریب بیٹھا ہوا سگرٹ پیتا رہتا۔ دو تین گھنٹے کے بعد وہ سونے سے اٹھ بیٹھتی اور مجھے جاگتا ہوا دیکھ کر پریم بھرے لہجے میں کہتی :-

"بھیا کب تک سگرٹ کے سہارے جاگو گے۔ اب آرام کرو"

سلسلۂ خیال آگے بڑھتا جاتا تھا۔ بے شک اس لڑکی کا بھائی ہونا بہت بڑی نعمت ہے۔ لیکن بہن کی محبت محدود اور یک رخی ہوتی ہے۔ وہ صرف بہن بن کر اپنے بھائی سے محبت کر سکتی ہے۔ اسکی محبت میں وسعت اور لوچ بالکل نہیں۔ ہاں ایک رشتہ البتہ اس قسم کا ہے جو اپنے پھیلاؤ کے لحاظ سے دوسرے تمام رشتوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس رشتہ کی محبت انسان کی زندگی کو اس طرح گھیر لیتی ہے جیسے کسی ظرف کے خلاؤں میں ہوا بھر جائے۔ صرف یہی محبت ایسی ہے جو سیل رواں کی طرح آزاد اور سمندر کی طرح بے پایاں ہے۔ یہ خیال کر کے میں نے دوبارہ اس لڑکی پر نظر ڈالی۔ مجھے یہ بتا دینے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کہ اب کی میں نے بالکل دوسری حیثیت سے اسے دیکھا۔ وہ اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے بائیں ہاتھ کی چوڑیوں کو آہستہ آہستہ پھرا رہی تھی۔ اس کی کہنیوں تک عریاں باہیں دلائی سے باہر تھیں۔ نگاہوں کا رخ اوپر کی اوس بنچ کی جانب تھا جہاں اسباب رکھا جاتا ہے۔ لیکن آنکھوں میں محویت کی ایسی جھلک تھی گویا وہ بند کھڑکیوں کے اس پار دور، میلوں دور کسی دھندھلی چیز کو غور سے دیکھنے میں منہمک ہے۔

میں نے پیچھے کھسک کر لکڑی کی دیوار کا سہارا لے لیا تاکہ بالائی بنچ کا سایہ میرے چہرے کو تاریکی میں چھپا لے۔ یہ میں نے اس خیال سے کیا کہ لڑکی کے بیساختہ پن میں مخل ہوئے بغیر میں بے دھڑک اُسے دیکھتا رہوں۔

میں سوچنے لگا اس شخص کی مسرت کا اندازہ کون کر سکتا ہے جس کے دامن مراد میں یہ بے بہا موتی ٹانکا جانیوالا ہے۔ یہ خیال کر کے مجھے پیشتر سے زیادہ کامل طور پر یقین ہونے لگا کہ بیوی کا رتبہ ہر حیثیت سے زیادہ بلند ہے۔ بہن محض بہن ہے۔ لیکن بیوی ایک ہی وقت میں بہن بھی ہے، بیٹی بھی اور ماں بھی۔ کبھی وہ ایک فرمانبردار بیٹی کیطرح اپنے شوہر کی خدمت کرتی ہے۔ کبھی اس کے سینے میں مادرانہ محبت کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں، اور کبھی وہ ایک جاں نثار بہن کیطرح دکھ درد میں شوہر کا غم اپنے سر لیلیتی ہے۔ اسی طرح ان دونوں کی محبت میں بھی فرق ہے۔ بہن کی محبت ایسی ہے جیسے لوبان کی خوشبو، جسے سونگھ کر دماغ میں تقدس اور پاکیزگی کی موجیں پھیل جاتی ہیں، ایسی خوشبو جو ارد گرد کی تمام فضا کو روحانیت کی شمیم سے معطر کر دیتی ہے۔ بیوی کی محبت بیلے کے ادھ کھلے تازہ پھولوں کی خوشبو ہے۔ جو دل کو بھی متاثر کرتی ہے دماغ کو بھی اور حواس کو بھی۔ جسکی عطریت روحانی جذبات کیساتھ ساتھ مادی حسیات کو بھی آہستہ سے چھیڑ دیتی ہے۔ لیکن اس لطافت سے کہ مجموعی اثر میں سے نہ ہم مادی تاثرات کا نمایاں طور پر امتیاز کر سکتے ہیں نہ روحانی تاثرات کا۔

خدا جانے کیوں، اسی ایک لمحہ میں مجھے اپنی زندگی بہت بے مزہ نظر آنے لگی۔ سال بھر تک مسلسل وہی ایک پروگرام۔ ایک سے دن۔

یک سی راتیں۔ صبح اٹھ کر جلے ہوئے توس اور ٹھنڈی چائے کا ناشتہ۔ ۸ بجے کتابیں لیکر کلاس چلے جانا۔ وہاں سے ۱بجے تھکے ماندے نڈھال واپس آکر کبھی کمرے ہی پر اور کبھی ڈائننگ ہال میں کچا پکا کھانا زہر مار کرنا۔ شام کو کچھ دور ہوا خوری، یا ٹینس کا ایک آدھ سٹ۔ رات کو کالج کے مست بے فکروں کے بے معنی قہقہوں کی گونج۔ وہی یکسانیت، وہی تواتر۔ یا خدا یہ زندگی ہے یا مستقل عذاب! میں تعجب کرنے لگا کہ اس مہمل زندگی کو اب تک میں خواہ مخواہ کیوں دلچسپ سمجھتا رہا۔ مجھے ان لوگوں پر غصہ آرہا تھا جو علیگڈھ کالج کی زندگی کو آکسفورڈ کا نمونہ کہتے ہیں اور ہر جگہ علیگڈھ کی خوبیوں کے گیت گاتے پھرتے ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ یہ شہر بھی کوئی شہر ہے نہ کوئی پر فضا پارک، نہ تھیٹر، نہ سینما۔ بہت ہوا تو سال میں ایک مرتبہ کانووکیشن کا کوئی بڑا جلسہ ہوگیا۔ یا کہیں باہر سے کرکٹ کی کوئی ٹیم آگئی۔ یا کسی مشہور لیڈر کی یونین کلب میں تقریر ہوگئی۔ اور مزہ تو یہ ہے کہ یہی وہ گوناگوں دلچسپیاں ہیں جنہیں ہندوستان بھر میں اچھال اچھال کر آسمان پر چڑھایا جاتا ہے۔ کل علیگڈھ میں پنجاہ سالہ جوبلی کا وہ عظیم الشان جلسہ ہونیوالا ہے جس کے متعلق مسلسل آٹھ دس مہینہ سے ملک کے اخباروں میں غل مچ رہا تھا۔ مگر اس میں بھی کیا ہوگا؟ .... خیمے اور شامیانے استادہ کئے جائیں گے، پنڈال آراستہ ہونگے، پھاٹک پر موٹے موٹے حرفوں میں "ویل کم" لکھا ہوگا۔ رضا کاروں کی جماعتیں مختلف مقامات پر متعین ہوں گی۔ جوبلی کے میدان میں ڈاکٹر ضیاءالدین ہر طرف بوکھلائے ہوئے پھرتے نظر آئیں گے۔ دھواں دھار تقریریں ہوں گی۔ بڑے بڑے قومی رہنما اسٹیج پر ہاتھ ہلاہلا کر لکچر دیں گے اور یونیورسٹی فنڈ کے لئے چندے کی اپیل پر اجلاس ختم ہوجائے گا۔ چلئے بس، اس کے بعد کیا ہوگا؟ اسکے بعد:۔

پھر وہی زندگی ہماری ہے

کا وظیفہ ہوگا اور خشک بے نمک طالبعلمانہ حیات کی پھٹکار! کہیں ان ہنگاموں سے زندگی کی دلچسپیوں میں کوئی اضافہ ہوتا ہے! جن جلسوں کا مقصد ہی محض تجارت ہو وہ کیا خاک انسانی حیات کیلئے سرور و شادمانی کا باعث ہوسکتے ہیں! خصوصاً ایک امنگ بھرے نوجوان کے لئے ان چیزوں میں کیا لطف؟!

میں نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے سوچا کہ حکماء کا یہ قول لفظ بہ لفظ صحیح ہے کہ انسان کی زندگی شادی کے بغیر کبھی مکمل نہیں ہوسکتی۔ بے شک بے شک۔ میری تمام افسردگی اور بے دلی کا علاج شادی ہے۔ میں بھی کیسا بے وقوف ہوں۔ یہ خیال اب تک ذہن ہی میں نہیں آیا تھا۔ ایک سلجھے ہوئے دماغ کے تعلیمیافتہ نوجوانوں کے لئے ایک خوب رو اور خوش طینت لڑکی جو صحیح معنوں میں محبت کرنے والی بیوی ہو کس قدر لازمی چیز ہے ...... ایسی ہی خوب رو اور خوش طینت جیسی یہ لڑکی ہے!!

اس لڑکی کا خیال آتے ہی میرا چہرہ کسی موہوم روشنی سے دمک اٹھا اور سینے میں ہلکی ہلکی گدگدی ہونے لگی۔ میں نے پھر ڈرتے ڈرتے اس لڑکی پر نظر ڈالی۔ میری نگاہیں اس کے ریشم ایسے چمکیلے بالوں پر سے ہوتی ہوئی اس کے ماتھے کے سرخ ٹیکے پر جم گئیں۔ میں غور سے ٹیکے کو دیکھتا رہا، بہت دیر تک دیکھتا رہا، ٹیکے میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ چھوٹی دونّی کے برابر ایک گول چمکدار سرخ ٹیکا۔ لیکن اسے دیکھتے ہی دیکھتے میرے تمام ولولے سرد پڑ گئے، امید کے بادل دھندلے ہونے لگے اور میرا دل اس طرح نیچے بیٹھنے لگا، جیسے عنقریب معدے میں اتر جائے گا۔

ایک ہی انداز سے بیٹھے بیٹھے میں تھک گیا تھا۔ میں نے پہلو بدلتے ہوئے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تو وہ آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ مجھے اپنی حماقت پر خود ہی ہنسی آنے لگی۔ خواہ مخواہ ایک اجنبی لڑکی کے لئے اپنے دل کو ہلکان کرنا گدھا پن نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ بیچاری خدا جانے دلّی جا رہی ہے یا کہاں؟ ایسی ملاقات تو خواب کی ملاقات کی طرح حبابی اور بے نتیجہ ہے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں علیگڈھ کا اسٹیشن آجائے گا۔ میں وہاں اتر پڑوں گا۔ چار پانچ روز تک جوبلی کے ہنگاموں میں گذار رہوں گا پھر کتابوں میں سر کھپانا پڑے گا۔ کہاں میں اور کہاں یہ معصوم دیوی!!

جھوٹ کیوں بولوں، تھوڑی دیر کے لئے میں سوچنے لگا کہ یہ جو کسی ایک مذہب پر لوگ مرتے دم تک ڈٹے رہتے ہیں یہ محض ڈھکوسلا ہی ڈھکوسلا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ شرافت اور نیک چلنی سے زندگی بسر کر دے۔ بس، ہمیں اس سے کیا غرض کہ یہ بھلا آدمی عیسائی ہے یا یہودی۔ اب فرض کیجئے ایک سمجھدار پڑھا لکھا مسلمان اپنی خوشی سے ہندو ہو جائے تو اسمیں ہرج ہی کیا ہے، آخر ہندو لوگ بھی تو آدمی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ خواہ وہ روحانی آزادی ہو، خواہ جسمانی خواہ مذہبی۔ اچھا اسے جانے دیجئے۔ یہ جو عجیب غریب قانون تراشے گئے ہیں کہ فلاں مذہب کے لوگ صرف فلاں مذہب کے لوگوں سے شادی کر سکتے ہیں یہ بھی کتنی مہمل اور لغو بات ہے۔ میرے نزدیک تو یہ رکاوٹ سراسر ظلم ہے، ایسا ظلم جسے کھینچ تان کر مذہبی اصول کے حدود میں گھسیٹ لیا گیا ہو........ یہ خیال کرتے کرتے مجھے ہندو مسلمانوں کی موجودہ خانہ جنگیوں پر ایسا شدید صدمہ ہونے لگا، جیسے کسی نے تان کر دل پر زور سے گھونسہ رسید کر دیا ہے۔ ان جھگڑوں پر میرا دل ہمیشہ دکھتا تھا لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ جتنا رنج مجھے اسوقت ہوا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

مجھے تعجب تھا کہ اسی لڑکی کی نیند کہاں غائب ہو گئی ہے۔ میرے اور اس کے علاوہ درجے کے تمام لوگ بے خبر تھے۔ آزاد اور رشید بھی سانپ کی طرح گنڈلی مارے ایک دوسرے پر پڑے ہوئے تھے۔ تیز روشنی میں لڑکی کے کانوں کے آویزے اس طرح چمک رہے تھے جیسے بجلی کے چھوٹے چھوٹے قمقمے۔ شاید رات کے وقت دیر تک جاگنے سے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں ہلکا ہلکا گلابی پن آگیا تھا۔ چہرہ کچھ بھاری بھاری سا ہو رہا تھا۔

"ونہہ ہوگا بھی، نہیں سوتی ہے تو میری بلا سے مجھے کیا......... آخر مجھے کیا خبط ہوا ہے کہ خواہ مخواہ جاگ رہا ہوں۔ کب تک بیٹھا رہوں گا۔ اس کے علاوہ سب کو غافل پا کر کسی شریف نوجوان لڑکی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرح بے حیائی سے گھورنا کتنا بڑا کمینہ پن ہے۔"

یہ سوچتے ہی میں نے اپنے جسم کے چاروں طرف اچھی طرح کمبل لپیٹ کر اس کی تہون میں اپنا منہ چھپالیا۔ ایک جماہی لینے کے بعد اپنی بے چارگی کا خیال کر کے میں دو چار ٹھنڈی سانسیں بھرنے ہی والا تھا کہ یکایک کمپارٹمنٹ کے ایک کونے سے پھٹے ہوئے بانس کی سی نہایت کرخت آواز بلند ہوئی۔

"اندھے ہو نرے؟ آنکھیں نہیں ہیں کیا...... اب بکس کے اندر کی چیزیں ٹوٹ گئی ہوں گی کہ بچ گئی

ہوں گی ؟ - بدتمیز کہیں کے !!"

میں نے بوکھلا کر منہ پر سے کمبل ہٹا دیا۔ لڑکی کا بھائی جس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی چمڑے کے ایک پرانے بکس کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر کھسیانے پن کی جھلک تھی۔ اسکے مقابل کی بنچ پر ایک موٹا تازہ بدرو آدمی جو صورت سے کوئی دولتمند تاجر معلوم ہوتا تھا، ایک کہنی کے سہارے چھینٹ کے خوش رنگ لحاف سے گردن تک اپنا خوفناک چہرہ نکالے گرج رہا تھا۔

"گاڑی بھر راستہ پڑا ہے۔ مگر سوجھتا تھوڑی ہے .... نیا بکس لے کے ستیاناس کر دیا .... بے شرم کہ کوڑی کوڑی دام بھروالوں ؟"

سوداگر صاحب کا چہرہ انکی داڑھی سے بھی زیادہ سیاہ تھا۔ موٹے موٹے ہونٹ آگے کی طرف لٹکے ہوئے تھے۔ بدصورت چہرہ پر ایک بھدی پچکی ہوئی ناک اس طرح رکھی تھی جیسے سانپ کے ڈر سے کوئی پھولا ہوا مینڈک دبک کر بیٹھ جائے۔

نوجوان نے منمناتی ہوئی آواز میں زیر لب عذر خواہی کے چند ادھورے جملے ادا کئے جو تاجر کی ڈانٹ میں دب کر رہ گئے۔

"بس بس، چپ رہ۔ ایک تو اتنا بڑا نقصان کر دیا۔ اوپر سے خواہی نخواہی ٹر ٹر لگائی ہے۔ تبرا آیا ہے وہاں سے فیشن ایبل کی دم بن کے ۔"

آخری فقرہ نوجوان کے لباس کے متعلق تھا۔ وہ دھوتی کرتے کے بجائے بدقسمتی سے نیلے بانات کا کوٹ اور فلالین کا پتلون پہنے تھا۔

مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں اٹھ کر قریب آگیا۔

"جانے بھی دیجئے۔ بیچارے نے کوئی جان بوجھ کے تھوڑی نقصان کیا۔ اور نقصان ہی کیا کیا۔ ابھی تو آپ نے بکس کھول کر دیکھا تک نہیں، بیکار بات کا بتنگڑ بنانے سے کیا فائدہ، درگذر کیجئے ۔"

"واہ صاحب واہ، یہ بھی اچھی کہی کہ درگذر کیجئے ابھی صریحاً نیا بکس نیچے رکھا ہوا ہے۔ اندھا بھی ہو تو دیکھ لے۔ مگر صاحبزادے ہیں کہ جوانی کی ترنگ میں اسی پر سے بوٹ رکھتے ہوئے کھٹ کھٹ چلے جا رہے ہیں .... یہ بھی کوئی شرافت ہے"

مجھ میں ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ خواہ مخواہ کسی کو اپنے سے کمزور کو دباتے ہوئے دیکھتا ہوں تو ضرور غصہ آجاتا ہے۔ میرے مزاج کا پارہ چڑھنے لگا۔ نوجوان نے مجھے اپنی حمایت کرتے پایا تو اس کی بھی ڈھارس بندھ گئی۔ جی کڑا کرکے بول اٹھا۔

"کہہ تو دیا کہ بھولے سے پاؤں پڑ گیا، تم بھی عجیب آدمی معلوم ہوتے ہو کہ اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی ۔"

اس بات پر سوداگر آپے سے باہر ہوگیا۔ اکبارگی لحاف جھلا کر دور پھینک دیا اور تن کر بیٹھ گیا:

"مجھے کوئی ایسا ویسا سمجھا ہے کیا ؟ زیادہ بک بک کرو گے تو گردن میں ہاتھ دے کر کھڑکی کے باہر لڑھکا دوں گا، ساری شیخی کرکری ہوجائے گی .... حرام زادہ کہیں کا، پاجی !"

میرے تمام جسم میں آگ لگ گئی، میں پوری طاقت سے چلا اٹھا:-

"اے تم بھی کبھی اُلٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو، خدا جانے کہاں کا سڑا ہوا سوٹ کیس ہے اس کے لئے اس طرح ہاتھ دھو کر

پیچھے پڑگئے ہو، گھنٹہ بھر سے کان کھا رہے ہو کہ "نیا بکس خراب ہوگیا، نیا بکس خراب ہوگیا!!..... شرم تو نہیں آتی؟"

"واہ جی وہ نیا ہو یا پرانا۔ آپ کو کیا پڑی ہے جو دخل در معقولات کرنے کھڑے ہوگئے؟ جھگڑا ہو رہا ہے مجھ میں ان میں، آپ بے کار بیچ میں کودے پڑتے ہیں۔ جائیے بیٹھیے، اپنا کام کیجئے کوئی خدائی فوجدار ہیں آپ؟"

اس چیاؤں میاؤں میں بہت سے مسافروں کی آنکھ کھل گئی۔ کچھ لوگ سرک سرک کر قریب آگئے۔ کچھ دور ہی سے بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے آزاد اور رشید بھی میرے پیچھے آکر کھڑے ہوگئے۔

مجھے تاجر کے اس لٹھ مار جواب پر بہت تاؤ آیا۔ غصہ کی وجہ سے میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے آستین چڑھا کر سینہ تان لیا اور قریب تھا کہ ایک ہی گھونسے میں اس منہ پھٹ سوداگر کی پچکی ہوئی ناک کو دو تین انچ اور پچکا دوں کہ آزاد اور رشید "جانے دو جانے دو" کہہ کر مجھ سے لپٹ گئے، ادھر تمام مسافروں نے ہم زبان ہو کر تاجر کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

ہم لوگ اپنی اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئے اور لگے وہیں سے تاجر پر فقرے چست کرنے۔ دو چار منچلے مسافروں نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔ کسی نے انکی صورت کا مذاق اڑایا۔ کوئی ان کے آبنوسی رنگ پر پھبتیاں کسنے لگا۔ پہلے تو تھوڑی دیر تاجر لال لال آنکھیں نکالے غرّاتا رہا لیکن جب فوج کی فوج کو اپنے خلاف ہتیار بند پایا تو آخر ٹھنڈا پڑگیا۔

لڑکی کی یہ حالت تھی کہ ہم لوگوں کی ہر پھبتی پر کھلکھلا کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ ہنسی کے مارے اپنے بھائی کی پیٹھ پر لوٹی جاتی تھی۔ ہنسنے میں اس کے موتی ایسے دانت کھلتے تو مجھے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ ہنس ہنس کر بجلی گرانے کا محاورہ کیوں ایجاد ہوا ہے۔ ہم لوگ اسے ہنستا دیکھ کر ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے ایک سے ایک بہتر پھبتیاں چست کرتے میرے لئے یہ خوشی کچھ کم نہ تھی کہ وہ اس تماشہ سے لطف اٹھا رہی ہے۔

جب پھبتیوں اور فقروں کا ذخیرہ ختم ہوگیا تو آپس میں یہ صلاح ہوئی کہ تاجر صاحب کو جگہ کی تنگی کے باوجود پاؤں پھیلا کر اسقدر اطمینان سے لیٹے رہنے کا کوئی حق نہیں ہے، لہذا فوراً انہیں اٹھا کر بٹھا دینا چاہئے۔ پہلے تو نہایت شریفانہ لہجہ میں سہولت سے ہم لوگوں نے درخواست کی کہ "اٹھ کر بیٹھ جائیے" لیکن جب دیکھا کہ یہ دیو کسی طرح ٹس سے مس بھی نہیں ہوتا تو ایک ساتھ ان پر حملہ بول دیا گیا۔

ایک نے ہاتھ پکڑا، ایک نے ٹانگ لی۔ ایک نے لحاف گھسیٹ کر دوسری طرف ڈالدیا اور سوداگر صاحب کو

پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے

گٹھری کی طرح اٹھا کر دیوار سے لگا کے ایک کونے میں بٹھا دیا۔

کوئی دوسرا موقع ہوتا تو سوداگر کے تمام پاجی پن کے باوجود دل ہرگز گوارا نہ کرتا کہ اسے اس بری طرح پریشان کیا جائے۔ لیکن اسوقت اس کو جی کھول کر ستانے ہی میں بڑا مزہ مل رہا تھا۔ بلکہ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا ہم لوگ کوئی بہت بڑا کار ثواب انجام دے رہے ہیں۔ میں فطرتاً رحم دل ہوں۔ لیکن اسوقت میں اس لڑکی کی خوشنودی کیلئے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔

اسی ہڑبونگ میں علیگڈھ کا اسٹیشن قریب آگیا۔ گاڑی کی رفتار سست پڑگئی اور میرا دل یہ خیال کرکے ڈوبنے لگا کہ دو تین منٹ میں یہ دلچسپ ڈرامہ ختم ہو جائے گا۔

میں نے بہت ہمت کرکے لڑکی کے بھائی سے پوچھا۔

"آپ کہاں اتریں گے"

"میں۔؟ میں چندوسی جا رہا ہوں ...... علیگڑھ میں دوسری گاڑی بدلوں گا"

اس کے بعد اس نے رک رک کر کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ ...... آپ نہ ہوتے تو .... تو مجھے بہت پریشانی اٹھانا پڑتی، آپ علیگڑھ کالج میں پڑھتے ہیں نا؟"

"جی ہاں۔ میں سمجھتا ہوں آپ بھی دو چار روز کے لئے علیگڑھ میں اتر پڑیئے۔ ہمارے کالج کی جوبلی بڑے دھوم سے منائی جارہی ہے دور دور سے لوگ شریک ہونے آرہے ہیں۔ ذرا لطف ہی رہے گا"

مجھے خیال پڑتا ہے میرے اس فقرہ پر لڑکی نے اپنے بھائی کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو اس کے چہرے کے خطوط سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ کہنا چاہتی ہے "ہاں بھیا۔ ٹھہر جاؤ نا۔ ہرج ہی کیا ہے"

لیکن یہ محض میرا وہم ہی وہم تھا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ اس کے ہونٹ تک نہ ہلے۔ اس کا بھائی کہنے لگا۔

"میں اکیلا ہوتا تو ضرور ٹھہر جاتا۔ آپ ایسے دلچسپ لوگوں کی صحبت نصیب کہاں ہوتی ہے؟ لیکن میرے ساتھ میری بہن بھی ہے ...... میں آپ لوگوں کا بہت شکر گذار ہوں!"

لڑکی اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اٹھائے مجھ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے صاف ٹپک رہا تھا:۔

"اور میں بھی آپ کی بہت ممنون ہوں"

اتنے میں اسٹیشن آگیا۔ گاڑی گھڑ گھڑ کرتی ہوئی ٹھہر گئی۔ میں نے قلی پر اسباب رکھوایا۔ لڑکی اور اسکا بھائی اتر کر پلیٹ فارم پر کھڑے ہوگئے تھے۔ میں نے "خدا حافظ" کہتے ہوئے نوجوان کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو میں نے محسوس کیا کہ اسکا ہاتھ بہت نرم ہے میں دل ہی دل میں یہ سوچتا ہوا کہ بہن کا ہاتھ اس سے بھی کہیں زیادہ نرم ہوگا۔ بھاری قدموں سے آزاد اور رشید کے پیچھے پیچھے باہر چلا گیا۔

ہم لوگ کمرہ پر پہونچے تو ۲ بج چکے تھے۔ میری طبیعت بہت نڈھال ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا اُلٹے پیر پھر اسٹیشن واپس چلا جاؤں اور کم از کم اس وقت تک وہاں بیٹھا رہوں جب تک چندوسی کی گاڑی روانہ ہو جائے۔ چندوسی کی گاڑی صبح چار بجے چھوٹتی تھی۔ ابھی پورے دو گھنٹہ باقی تھے۔ لیکن میں نے سوچا واپس جا کر اپنی آنکھوں سے گاڑی کو اوجھل ہوتے ہوئے دیکھوں گا تو اور زیادہ تکلیف ہوگی۔ آخر دل کو پتھر رکھ لیا۔ روشنی گل کرکے اپنے بستر میں گھس گیا اور کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح جلد نیند آجائے تو یہ تمام تکلیف دہ خیالات دھل جائیں۔

کوشش کے باوجود میں کسی طرح اپنی توجہ آج کے واقعات سے نہ ہٹا سکا۔ بار بار لڑکی کی صورت آنکھوں کے نیچے پھر جاتی تھی۔ اسکی تمام چیزوں میں دو چیزیں مجھے سب سے زیادہ یاد آرہی تھیں۔ ایک تو اس کے ماتھے کا گول سرخ ٹیکا۔ دوسرے اس کے چھوٹے چھوٹے دانتوں کی چمکدار لڑی۔ مجھے اس کے تصور میں لطف بھی آرہا تھا اور تکلیف بھی ہو رہی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی آہستہ آہستہ میرے سینے میں

کانٹے چبھو رہا ہو۔ اسی ادھیڑبن میں بہت دیر ہوگئی۔ رفتہ رفتہ میرے پپوٹے بھاری ہونے لگے۔ تخیلی پیکر بتدریج دھندلے پڑنے لگے اور مجھے نیند آگئی۔

میں سمجھتا ہوں میری آنکھ لگے بمشکل دس۱۰ پندرہ۱۵ منٹ گذرے ہونگے کہ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ رہا ہے۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ کمرہ میں اندھیرا پڑا ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں ملکر دیکھا تو میری چارپائی کے قریب ریل والی لڑکی کا بھائی کھڑا ہوا تھا اندھیرے میں نہ اسکی صورت اچھی طرح نظر آتی تھی نہ کپڑوں کا رنگ نظر آتا تھا۔ لیکن اس کی آواز صاف پہچانی جاتی تھی۔ وہ دبی زبان سے آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا:-

"بڑی مشکل میں آپکا کمرہ ملا ہے۔ جلدی اٹھئے گاڑی کا وقت بہت تنگ ہے...... آپ تو اس طرح غافل پڑے سو رہے ہیں جیسے آپکو کہیں جانا ہی نہیں ہے۔ آپ کو اسٹیشن واپس آنے میں دیر لگی تو میں گھبرا کر آپکو لینے چلا آیا۔ میں نہ آجاتا تو آپ سوتے ہی رہ جاتے۔"

"بڑی مشکل میں کمرہ ملا ہے"...... "اسٹیشن واپس آنے میں دیر لگی"...... "آپ کو لینے چلا آیا" میں حیران تھا کہ خدایا آخر یہ کہہ کیا رہا ہے۔ مجھے اس بات پر بھی تعجب ہو رہا تھا کہ بند کمرہ میں یہ کس طرح گھس آیا۔ لیکن مجھے فوراً یاد آگیا کہ سوتے وقت میں اندر سے دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔

پھر مجھے یہ بھی خیال آگیا کہ میں نے اس کے ساتھ چندوسی چلنے کا وعدہ کر لیا تھا اور اس سے یہ کہہ آیا تھا کہ میں آزاد اور رشید کو بورڈنگ پہونچا کر ابھی واپس آتا ہوں۔ یہاں آکر اپنا وعدہ بھول گیا۔ میرا دل اس غیر متوقع خوشی سے دھڑکنے لگا۔ میں اچھل کر چارپائی سے نیچے کود پڑا۔ اندھیرے میں ٹٹول کے بغیر موزوں کے جلدی سے جوتا ڈانٹ لیا۔ کھونٹی پر سے شیروانی گھسیٹ کر گلے میں اٹکائی۔ اور ہاتھ میں ٹوپی لیکر نوجوان کا ہاتھ پکڑے آہستہ آہستہ پنجوں کے بل کمرہ کے باہر نکل گیا۔

میں نے یہ احتیاط اس لئے کی کہ میں چاہتا تھا کہ آزاد اور رشید کو اس واقعہ کی ہوا نہ لگے۔ مجھے یقین تھا کہ اسوقت ذرا بھی کسی کی آنکھ کھل گئی تو پھر میں قیامت تک چندوسی نہ جا سکوں گا۔ صبح اٹھ کر یہ لوگ میرے یکایک غائب ہو جانے پر کتنے حیران ہونگے۔ یونیورسٹی کے کونے کونے میں ڈھونڈتے پھریں گے۔ ایک ایک سے میرا پتہ پوچھیں گے۔ ان مسخروں کے خواب وخیال تک میں یہ بات نہیں آسکتی کہ خود اس دلربا لڑکی کا بھائی آکر مجھے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ یہ خیال کرکے میں آپ ہی آپ ذرا اور تن کر چلنے لگا۔

پھاٹک کے باہر ایک تانگہ کھڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں جست مار کر اس پر بیٹھ گئے۔ راستہ بھر ہم دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی اسوقت مجھے رہ رہ کے جوبلی کے جلسوں کا خیال آنے لگا۔ پھر باہر سے آنے والے دوستوں کا اور آل انڈیا مشاعرہ کا اور نواب بھوپال کا...... مگر میں نے کہا ہٹاؤ جی، ہوگا بھی، اس قسم کے جلسے تو ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ایسا سنہرا موقع کوئی روز روز تھوڑی ہاتھ آتا ہے۔

سڑک پر ہر طرف اندھیرا گھپ تھا۔ تانگہ کا گھوڑا تک صاف نظر نہیں آتا تھا۔ دونوں طرف درخت اس طرح کھڑے ہوئے تھے جیسے کالے دیو۔ اسٹیشن پہونچکر ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔ گیس کی روشنی جو معمولاً بہت تیز ہوتی تھی آج کسی قدر مدھم نظر آرہی تھی۔

پلیٹ فارم پر جو لوگ ادھر ادھر چل پھر رہے تھے انکی صورتیں اچھی طرح نہیں پہچانی جاتی تھیں۔ میں نے خیال کیا جاڑوں کی رات ہے کُہرا بہت زور سے گر رہا ہے، تب ہی ہر چیز دھندلی دھندلی نظر آتی ہے۔

چندوسی کی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ گارڈ سبز لالٹین دکھا رہا تھا۔ گھبرائے ہوئے مسافر جلدی جلدی اسطرف سے اسطرف آجا رہے تھے ہم لوگ کود کر ایک درجہ میں چڑھ گئے اور گاڑی بھی روانہ ہوگئی۔

درجہ میں صرف تین آدمی تھے، میں، لڑکی کا بھائی، اور خود لڑکی جو اوڑھے لپیٹے ایک بنچ پر دراز تھی۔ بیچاری رات بھر جاگتی بھی تو رہی تھی۔ مجھے اسکے منہ ڈھانپ کر سوتے رہنے کا مطلق افسوس نہیں تھا میرا دل مطمئن تھا کہ جب وہ جاگے گی تو میں دل کھولکر اسکی صورت دیکھ سکوں گا۔

راستہ میں اس کے بھائی سے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر اس نے مجھے ہندی کا ایک اخبار پڑھنے کو دیا اور میں اس اخبار کو اتنی دیر تک پڑھتا رہا کہ چندوسی کا اسٹیشن آگیا۔ نوجوان نے اپنی بہن کو جگادیا۔ ہم لوگ اسٹیشن سے باہر نکلکر ایک یکہ میں بیٹھ گئے جسمیں چھوٹا سا مریل ٹٹو جتا ہوا تھا۔ ان لوگوں کا مکان اسٹیشن سے قریب ہی تھا، تھوڑی دیر میں یکہ ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے رک گیا۔ ہم تینوں کھٹ کھٹ کرتے ہوئے زینے پر چڑھ گئے۔ یہ ایک ٹھیٹ مشرقی ساخت کا مکان تھا۔ جس کے سامان آرائش میں کہیں کہیں مغربیت کی خفیف سی جھلک نظر آتی تھی۔ جس کمرے میں ہم لوگ داخل ہوئے اس میں یہاں سے وہاں تک صاف ستھری نیلی دری کا فرش تھا کمرہ کے وسط میں دیوار سے ملا ہوا ایک رنگین اونی قالین بچھا ہوا تھا اس پر ایک سفید براق گاؤ تکیہ، ایک طرف تین چار نیچی نیچی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دیوار پر چند پرانی مذہبی تصویر کے ساتھ ساتھ دو چار موجودہ زمانہ کی بھی تصویریں آویزاں تھیں۔ دروازوں پر سفید جالی کے پھولدار پردے پڑے ہوئے تھے، بحیثیت مجموعی کمرہ میں سادگی اور نفاست تھی۔

میں جاتے ہی دھم سے ایک کرسی پر گر پڑا۔ جیسے کوئی بلا کا تھکا ہوا ہو۔ لڑکی اور اسکا بھائی مجھ سے ذرا ہٹ کر دروازہ میں کھڑے ہوکر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ شاید میری مہمانداری کے متعلق آپس میں کچھ مشورہ کر رہے ہوں، اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کا برہمن جسکے آگے کے دو دانت ٹوٹے ہوتے تھے اپنے برہنہ جسم پر ایک میلا جنیو ڈالے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کے طرز عمل سے میں نے فوراً تاڑ لیا کہ وہ اس گھر کا کوئی پرانا منہ چڑھا ملازم ہے۔ منہ چڑھے ہونے کا خیال مجھے زیادہ تر اسوجہ سے پیدا ہوا کہ اس نے مجھے دیکھ لینے کے باوجود سلام کے لئے ہاتھ تک نہ اٹھایا، اس نے اپنا بدن کھجا کھجا کر نوجوان سے کہنا شروع کیا:۔

"ماتاجی تو کل سے ڈپٹی صاحب کی بیٹی کے بیاہ میں گئی ہوئی ہیں۔۔۔۔۔۔ مجھ سے کہہ گئی تھیں کہ بھیا صبح کی گاڑی سے آئیں تو سیدھے یہیں بھیج دینا، آپکا بھی نیوتا تھا"

"اور رجنی؟، رجنی کے لئے کچھ نہیں کہہ گئیں؟"

"ان کے آنے کا معلوم ہی کسے تھا؟ پہلے چٹھی آئی تھی کہ آئیں گی، پھر لکھا ہولی تک آنے کا کوئی ٹھیک نہیں۔۔۔۔ نابابو میں جھوٹ کیوں بولوں، رجنی کے لئے کچھ نہیں کہہ گئیں"

نوجوان نے کسی قدر پریشان ہو کر کہا

''لیکن میں......... میں اس وقت کیسے جا سکتا ہوں؟ دیکھتے نہیں ہو میرے ساتھ یہ مہمان ہیں۔ آخر ان کو اکیلا تھوڑی چھوڑ سکتا ہوں؟''

لڑکی جوان دونوں کو باتیں کرتا دیکھ کر ابھی تک خاموش کھڑی اپنی ساری کے آنچل کو انگلیوں میں مروڑ رہی تھی اکدم بول اٹھی:۔

''بھیا تم اس کی فکر نہ کرو۔ تمہیں جانا ہے تو جاؤ۔ میں ان کی دیکھ بھال کر لوں گی دونوں میں سے کوئی بھی نہ جائے گا تو ڈپٹی صاحب برا مانیں گے......... ہاں اور آپ کو ہارمونیم بجانا بھی آتا ہے؟''

یہ پہلا سوال تھا جو لڑکی نے مجھ سے دریافت کیا۔ میں سٹ پٹا گیا۔ میرا دل زور زور سے اچھلنے لگا اپنی آواز پر قابو پا کر میں بولا:۔

''جی ہاں کچھ یوں ہی سا...... بجانا تو کیا جانتا ہوں، یونہی الٹی سیدھی انگلیاں مار لیتا ہوں''

''آپ دیکھتے ہیں کہ ڈپٹی صاحب کے یہاں جانا بہت ضروری ہے'' نوجوان عذر خواہی کے لہجہ میں مجھ سے کہنے لگا۔ ''میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا بس یہی کوئی ڈیڑھ گھنٹہ، آپ اطمینان سے شیروانی وغیرہ اتار کر بیٹھئے......... اور دیکھو رجنی وہ ماسٹر موہن کے ریکارڈ بھی ذرا آپکو سنانا، تو سمجھے آپ میں ابھی آتا ہوں گھبرائیے گا نہیں۔ کنبہ برادری کا معاملہ ہے، نہیں تو میں ٹال جاتا''

یہ کہکر نوجوان وہاں سے چلا گیا۔ میں اور لڑکی کمرہ میں تنہا رہ گئے۔ بوڑھا برہمن بھی کام کاج کرنے کے لئے رفو چکر ہو چکا تھا۔ اپنے کو لڑکی کے ساتھ تنہا پا کر گھبراہٹ کی وجہ سے میری سانس پھولنے لگی، لڑکی مجھ سے کہنے لگی:۔

''تکلیف تو ہوگی۔ ذرا جب تک کوئی چیز ہی سنا دیجئے، دیکھئے وہ سامنے باجہ رکھا ہے''

کمرہ کے ایک کونے میں سیاہ لکڑی کا فولڈنگ ہارمونیم رکھا ہوا تھا۔ اس کے برابر نازک سفید روغن کی کرسی رکھی تھی۔ میں نے موقعہ کو غنیمت جانا، چپکے سے اٹھ کر باجہ کے پاس بیٹھ گیا۔ لڑکی پاؤں سکیڑ کر اور کہنی سے گاؤ تکیہ کا سہارا لیکر قالین پر بیٹھ گئی۔ اسکا انداز نہ بیٹھنے کا تھا نہ لیٹنے کا دونوں کے درمیان سمجھئے۔

اب میرے لئے بڑے نازک موقع کا سامنا تھا۔ میں سوچنے لگا آخر کیا گاؤں اور کیا نہ گاؤں! دل تلملا رہا تھا کہ کوئی ایسی حسب حال موقع کی چیز چھیڑ دوں کہ یہ لڑکی بھی تڑپ کر رہ جائے، لیکن وہ موقع کی چیز کیا ہو؟ یہ البتہ ٹیڑھا سوال تھا۔ غزل گانا بالکل بے کار تھا۔ بھلا وہ بیچاری اس سے کیا لطف اٹھائے گی؛ البتہ کوئی مزے دار ٹھمری یا چلتا ہوا دادرا یاد آجاتے تو کام چل جائے۔

تیر کی طرح میرے ذہن میں ایک بات آگئی۔ خوشی کی وجہ سے میری سانس رکنے لگی۔ مجھے ایسا داؤں یاد آگیا تھا جو کبھی پٹ نہیں پڑ سکتا تھا۔ میں بہت دیر سے اس چکر میں تھا کہ آخر اس لڑکی کو کس چیز سے تشبیہ دوں۔ لیکن اسوقت یہ معمہ آن واحد میں حل ہو گیا۔ مجھے یاد آگیا کہ کسی ایسی ہی غیر معمولی لڑکی کو ریل کے سفر میں یلدرم نے دیکھ کر ''آہو'' والا گیت لکھا تھا، کسقدر با موقع! کتنا مناسب حال! بے شک یہ لڑکی بھی بالکل ''آہو'' ہے، کالی کالی دراز پلکیں۔ سیاہ وحشت بھری آنکھیں۔ لانبی سڈول گردن۔ بس بس آہو سے بہتر اس کے لئے کوئی نام نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس آہو میں اور یلدرم کے آہو میں تھوڑا سا فرق ہے۔ اس میں شوخی اور رمیدگی بھڑک اور چلبلا پن تھا۔ میرے آہو میں

معصومیت اور بھولا پن، سکون اور ٹھہراؤ ہے۔

یہ خیال آتے ہی میں نے کرسی کو باجہ کے قریب سرکا لیا۔ دونوں پاؤں دھونکنی پر رکھدیئے۔ اور انگلیوں سے آہستہ آہستہ پردوں کو چھیڑنے لگا۔ صبح کا وقت تھا۔ میں نے کہا لاؤ اس گیت کو اساوری کے سروں میں گاؤں، مضمون کے لحاظ سے بھی حسب حال رہے گی اور وقت کے لحاظ سے تو با موقع ہے ہی: میں کچھ دیر پردوں پر انگلیاں مارتا رہا۔ پھر دھیمی دھیمی آواز میں گانا شروع کیا:۔

ماتھے پہ بندی ——— آنکھ میں جادو ——— ہونٹوں کی بجلی ——— گرتی تھی ہر سو
گرتی تھی ہر سو ——— ہونٹوں کی بجلی ——— گرتی تھی ہر سو ——— گرتی تھی ہر سو
ہونٹوں کی بجلی

میں نے رفتہ رفتہ اپنی آواز کو بلند کرنا شروع کیا، اسوقت میرے لہجہ میں اسقدر گداز پیدا ہو گیا تھا کہ مجھے خود تعجب ہو رہا تھا۔ اپنی تمام عمر مجھے اسکا اندازہ نہیں ہوا تھا کہ میری آواز میں اس بلا کا درد چھپا ہوا ہے۔ میں نے مزے میں آکر آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں خود نہیں بلکہ کوئی دوسرا شخص مجھ سے دور بیٹھا ہوا تانیں لگا رہا ہے۔ مجھے اپنی آواز کسی دوسرے کی آواز معلوم ہوتی تھی لیکن نہایت نرم و شیریں، پر اثر اور درد بھری۔ میرا جی بھی اندر ہی اندر امنڈ رہا تھا۔ جیسے کوئی سینہ میں بیٹھا ہوا دل کو پکڑ کر مٹھی سے زور زور سے دبا رہا ہو۔ پردوں پر میری انگلیوں کی رفتار تیز ہوتی جاتی تھی، اس کے ساتھ ہی ہر اونچی تان پر مجھکو معلوم ہوتا تھا گویا میں خود اپنی الاپ کے ساتھ اوپر اڑا جا رہا ہوں، میں نے آنکھیں کھول کر کنکھیوں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرہ کا عجیب رنگ ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی مٹی کی بے رنگ مورت بٹھا دی گئی ہو، اس کی ضرورت سے زیادہ کھلی ہوئی آنکھیں میرے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں۔ دونوں لب ایک دوسرے سے کسی قدر علٰحدہ تھے، اور نگاہوں میں ربودگی کی عجیب و غریب جھلک تھی۔

میں تاڑ گیا کہ اس پر گیت کا اثر ہو رہا ہے۔ اور بری طرح ہو رہا ہے، میری ہمت اور بھی بڑھ گئی میں نے ایک زور کی تان لگائی:۔

ایسی بھڑک تھی ——— خلق تھی حیراں ——— ریل میں آیا ——— کہاں سے آہو
ماتھے پہ بندی ——— آنکھ میں جادو

آنکھ میں جادو ———

میں پوری طاقت سے لچکی کر دھونکنی پر پیر چلا رہا تھا۔ ہارمونیم کے پردے میری انگلیوں کے نیچے کھٹ کھٹ بول رہے تھے۔

لڑکی آہستہ سے اٹھکر میرے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی، اور میرے شانے پر ہاتھ رکھکر جلدی سے بولی:۔

"بس بس، اب اس سے زیادہ میں نہیں سن سکتی، رہنے بھی دیجئے، باجہ بند کیجئے، مجھے دھڑکن ہونے لگی ...... کیا مار ڈالنے کا ارادہ ہے؟" یہ کہہ کر اس نے زور سے میرا شانہ دبا دیا، میں اپنی کامیابی اور بھی تن گیا۔ لڑکی برابر خوشامد کر رہی تھی۔ میں نے اس کی ایک بھی نہ سنی۔ پردوں پر انگلیاں بھی تیز کر دیں اور دھونکنی پر پیر بھی۔ معلوم نہیں اس وقت مجھ میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی، مجھے تعجب تھا کہ دھونکنی پھٹ کیوں نہیں جاتی۔

"ریل میں آیا کہاں سے آہو........ کہاں سے آہو؟ آہو - آہو........"

اتنے میں میرے کانوں میں ایک آواز آئی جیسے کوئی کوئیں کی تہ سے کہہ رہا ہو:-

"بھئی تم نے بھی نحوست کی حد کر دی، نو بج چکے ہیں اور آپ ابھی تک پڑے اینڈھی رہے ہیں، جلسے میں چلنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟ چائے بھی پڑے پڑے ٹھنڈی یالا ہوگئی"

آنکھیں مل کے دیکھتا ہوں تو آزاد میرا شانہ پکڑ کر زور زور جھنجھوڑ رہا ہے اور کمرہ کے باہر برآمدے میں ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔

"اور یہ آپ سوتے میں ہاتھ پیر کیوں اچھال رہے تھے؟ کیا کسی سے پٹہ بازی کا مقابلہ ہو رہا تھا؟"

ذوقی

سب اشیاء کی یکجائی قیمت صرف دس روپے عـہ/10

مندرجہ ذیل پانچوں اشیاء قیمتی اٹھارہ روپیہ یکدم طلب کرنے پر مع محصولڈاک و پیکنگ صرف دس عـہ روپے میں روانہ کیجاویں گی۔ ہمارا مقصد قلیل منافع پر بہترین اشیاء خریداروں کو ہم پہونچانا ہے۔

نوٹ
ایک یا دو اشیاء کی خریداری پر کوئی رعایت نہیں

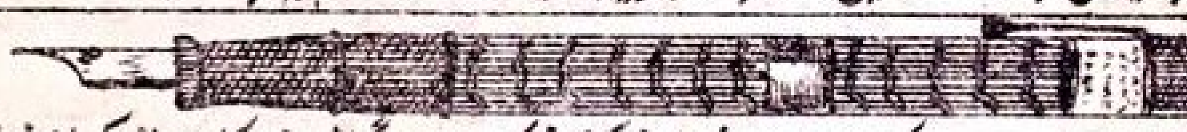

کارآمد فاؤنٹن پن

ایک مرتبہ سیاہی بھر کے صفحے کے صفحے لکھ دیتا ہے۔ گولڈن نب کا ہونے کے باعث برسوں کام دیتا ہے۔ بدخط انسان کو خوشخط بنا دیتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (عـہ)

ڈبل الارم ٹائم پیس

گارنٹی ۴ سال

جو خوبیاں قیمتی ٹائم پیسوں میں ہوتی ہیں وہ کاریگر نے اس میں جمع کی ہیں۔ پرزوں کا مضبوط۔ وقت کا سچا دیکھنے میں خوبصورت ہے اور ٹھیک وقت پر دونوں گھنٹی کی بلند آواز سے ہمسایوں تک کو بیدار کر دیتا ہے۔ رمضان المبارک کے لئے بہت کارآمد چیز ہے۔
قیمت علاوہ محصولڈاک چار روپیہ (للعہ)

فینسی رسٹ واچ

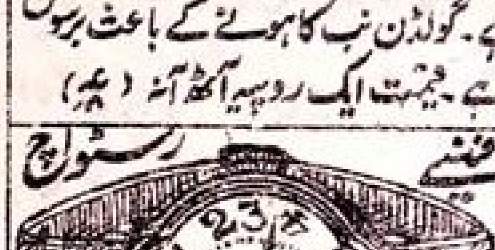

گارنٹی ۲ سال

۲۲ کیرٹ گولڈ پلیٹڈ رسٹ واچ۔ اپنی خوبی میں انتی۔ نوٹے روپیہ کی گھڑی سے مقابلہ کرتی ہے۔ ہر موسم میں صحیح ٹائم بتاتی ہے۔ از حد خوبصورت اور بہت پائدار ہے۔ اس کو مرد و عورت دونوں بہت خوشی سے استعمال کرتے ہیں۔
قیمت چھ روپے (سـے)

لیور پاکٹ واچ

گارنٹی ۵ سال

ایک مستند کاریگر کی ساخت ہونیکے باعث مشین کی مضبوطی، وقت کی سچی، صورت و شکل دونوں میں خوبصورت ہے۔ (ہندکی آب و ہوا کے موافق بنائی گئی ہے)
قیمت پانچ روپے (ـعہ)

سنہری گولڈ چوڑیاں

امیٹیشن طلائی خول میں ریشمی چمکدار چوڑیاں نیلم و پکھراج کی جڑاؤ سینکڑوں روپیہ کی لاگت کا اندازہ کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر عورت ان پر فدا ہے۔ قیمت مکمل سٹ ایک روپیہ آٹھ آنہ (عـہ)

نوٹ نمبر (۱)

جو صاحب فاؤنٹن پن یا چوڑیاں دونوں میں سے ایک اشیاء خریدنا نہ چاہیں ان کو بقیہ چاروں اشیاء نو روپیہ (للعہ) میں روانہ کیجاویں گی +

نوٹ نمبر (۲)

جو صاحب فاؤنٹن پن اور چوڑیاں دونوں خریدنا نہ چاہیں ان کو بقیہ تینوں گھڑیاں آٹھ روپے (سـعہ) میں روانہ کی جاویں گی +

ملنے کا پتہ: چیپ واچ ہاؤس اجمیری گیٹ دہلی

فلسفۂ مذہب

مذہب اور اخلاق

انسان کی عام عادات و اطوار پر بحث کرنا علم اخلاق کی اجمالی تعریف ہے، مگر ایسی صورت میں اخلاق کے وسیع دائرہ میں ایسے مضامین بھی آجائیں گے جنکا تعلق زیادہ تر علم تاریخ علم انسان یا علم انساب سے ہے یعنی مختلف ادوار و زمانہ میں انسان کے گوناگوں معاشرت و تمدن پر تاریخی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالنا ضروری ہوجائیگا۔ اس لئے عام طور سے اخلاقی بحث صرف ان مسائل پر محدود سمجھی جاتی ہے کہ انسان کے اطوار و عادات کن اخلاقی اصول کے تابع ہیں لیکن اگر ہم اخلاق کو صرف اطوار انسانی کا ایک علم سمجھیں تو وہ دو حیثیت سے غلط ہوگا اول تو یہ کہ علم یا تو نظری ہوگا یا عملی۔ نظری حیثیت سے انسانی اعمال کی ایسی تشریح کرنا کہ زمانہ گذشتہ یا موجودہ میں ان پر نیک و بد کا اطلاق کیوں کر ہوا ممکن نہیں عملی حیثیت سے بھی یہ کوئی مفید مقصد پیدا نہیں کرتا۔ کیونکہ ایسی صورت میں ہمارے ضمیر یا ادراک اخلاقی کو ایک ہی وقت میں تجربہ اور مجترب بننا پڑیگا، دوسرے یہ کہ اخلاق ایک فلسفہ ہے نہ کہ علم اور فلسفہ کے معنی یہ ہیں کہ جو مسلمات ہمارے خیالات سے پیدا ہوتے ہیں انکی کنہ دفیہ پر بحث کی جائے اخلاق پر بحث کرتے وقت ہمارے سامنے یہ مسلمات مثلاً حقوق، فرائض، ارادۂ انسانی، خیر و شر، خطا و کرب پہلے سے موجود ہوتے ہیں، اور فلسفہ اخلاق سوائے اس کے کہ ان مسلمات کو اپنی بحث میں ضبط کرے۔ ایک حد تک اس کی تشریح نہیں کرتا۔

یہ سوال کہ ضمیر انسانی میں کس وقت اور کس دور میں نیک و بد کے تمیز کرنے کی قابلیت پیدا ہوئی۔ وہ بھی اس کے فلسفیانہ بحث سے خارج ہے، اخلاق صرف ایسے مسائل سے بحث کرتا ہے جیسے انسان جب ایک کام کا ارادہ کرتا ہے تو اسکے دل پر خود بخود ایسے سوالات کیوں پیدا ہوتے ہیں، فلاں حالت میں ہمارا فعل عدل و انصاف کے متقاضی ہے یا نہیں یا فلاں شخص کی ناواقفیت سے فلاں کام کرنیکی ذمہ داری اس پر کہاں تک عائد ہوتی ہے، وغیرہ، یا پھر ان اشکال کو پورے طور سے سمجھنے کی کوشش کرنا جس کے بموجب ارادہ کو عمل کی صورت میں لایا جاتا ہے یا ایسے لوگوں کی شخصیت پر کلام کرنا جو عام طور سے اس کے معمول یا موثر ہوتے ہیں یا ان نتائج پر غور کرنا جو ان اعمال سے پیدا ہوں۔

فلاسفہ متقدمین نے اخلاق کی بحث انسانی علم سے شروع کی ہے۔ اور متاخرین نے "قانون فطرت" سے۔ بقول گروٹیس (Grotius) "قانون فطرت" الہامی یا خدائی قانون کا ایک حصہ ہے جسکا کام انسان کے جذبات فطری کی ترجمانی کرنا ہے اور فطرت انسانی کا یہ خاصہ ہے (جسکی وجہ سے اس کو دوسرے حیوانات سے امتیاز حاصل ہے) کہ وہ اپنے ہمجنس کے ساتھ سلامت روی سے رہنے کا خواہشمند ہو اور اسوجہ سے اسکا چند اصول پر کاربند ہونا ضروری ہے، چنانچہ قانون فطرت ایسا ناقابل تبدیل قانون فطرت ہے کہ خدا کی بھی عادت اس کے تبدیل کرنے کی نہیں ہے (اسکا مقابلہ قرآنی آیت "لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا" سے کرو) اور اس کے اصول ویسے ہی

مستحکم ہیں جیسے ریاضی کے اصول۔ گو کہ بعض عواقب و نتائج کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی خاص وقت و زمانہ میں اس کے بعض اصول منسوخ کردئے جائیں مگر یہ احکام ناسخ بھی خدا ہی کے ہو سکتے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قانون ابدی و ازلی خدا کی ذات کی طرح ہیں۔ اگرچہ بظاہر طبیعت انسانی کے غیر مقبول و مجبول ہونے پر و حادث ہی "سمجھے جائیں" یہ خیال زیادہ تر متاخرین رومی قانون دانوں کے خیالات کا پرتو ہیں۔ جنکے نزدیک قانون فطرت کے یہ معنی تھے کہ وہ دنیاوی قوانین کے اصل مبادی و بنیاد ہیں۔ اور دنیاوی قوانین کے ذریعہ سے انکا پتہ لگ سکتا ہے جو شاید ایک وقت میں دنیاوی قوانین کی تفسیر سے مستغنی ہو جائیں۔ اور جب تک یہ صورت پیدا نہیں ہوتی وہ ایک ایسا نمونہ ہیں جو دنیاوی شریعت کی رہبری کرتی ہیں۔ انسانی تاریخ کا ایک زمانہ ایسا بھی سمجھا جاتا ہے۔ جب انسان صرف اس قانون فطرت کا پابند تھا۔ اور وہ زمانہ انسان کی تربیت کے پہلے کا ہے۔ شاید یہ وہی زمانہ ہو جسکو ہنود ست جگ کہتے ہیں اور یا سوڈئیس (Posodeus) یونانی نے "زمانہ زرین" کے نام سے یاد کیا ہے یا بائبل نے اسکو آدم و باغ عدن سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ زمانہ جب انسان حالت طبعی میں علٰحدہ علٰحدہ اپنے بال بچوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا اور اسکی پابندیوں میں صرف اسقدر تھا کہ وہ ایک دوسرے کو گزند نہ پہونچائیں۔ اور دنیا کی نعمتوں کے حاصل کرنے میں خلل انداز نہوں۔ یا اپنے والدین کا کہنا مانیں یا اپنے بیویوں سے حسن سلوک سے پیش آئیں یہ ہے قانون فطرت کی تعریف جو گروٹیس نے کی ہے اور اسکی مدد سے ایک حد تک بین الاقوامی حقوق و فرائض کے معین کرنے میں کام لیا گیا ہے کیونکہ اجتماعی حالت میں اقوام کے باہمی تعلقات قریب قریب وہی ہوتے ہیں جو دو خاندانوں یا دو انسانوں میں ہوتے ہیں۔ البتہ یہ فرض نہیں کیا گیا کہ ان قوانین کے عمل پر انسان مجبور بھی تھا۔ کیونکہ حقوق انسانی کے پامالی پر جد و جہد و جنگ کا قائم ہونا بھی فطری تصور کیا گیا ہے قانون فطرت کا یہ تصور کہ وہ صحیح الدماغی کا ایسا حتمی فیصلہ ہے جو ہے انسان کی طبائع عقلیہ اور مدنیہ پر حاوی ہو۔ اس بنا پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ پابندی معاہدہ بھی اگر فطرت انسانی کا خاصہ نہیں ہے تو اسیر ابتدار سے اسکا معمول رہا ہے اور ان معاہدات کی پابندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشیائے عالم پر انسان کی ملکیت تسلیم کی جانے لگی۔ جو پہلی صورت یعنی جلب منفعت میں ایک دوسرے کی مخالفت نہ کرنے کا ایک ارتقائی درجہ ہے اور یہ ہی ابتدائی معاہدہ سلطنت و حکمرانی بنیاد ہیں۔

گروٹیس کے ان نظریات پر لازمی طور سے یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کن وجوہات سے انسان قانون فطرت کی پابندی پر مجبور ہوا۔ انسان کہاں تک اور کس حیثیت سے مدنی الطبع کہلایا جاسکتا ہے۔ اور انسان کے طبائع عقلیہ و مدنیہ میں پابندی معاہدہ کے اوصاف کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

انسان کے جذبات فطری کا مدعا حفظ نفس ہے یا حفظ نفس۔ عدم حفظ نفس یا عدم حفظ نفس جو انسان اپنے لئے بلا و مصیبت و بدی خیال کرتا ہے۔ اسیر جہاں تک اوسکی ذات کا تعلق ہے جان بوجھ کر انسان کبھی عامل نہیں ہوسکتا تا وقتیکہ ان بدیوں اور برائیوں کے اندر وہ دنیا یا عاقبت میں اپنے حفظ نفس یا حفظ نفس کے لئے انجام نیک نہ جانتا ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان پر جو برائیاں اور مصیبتیں آتی ہیں وہ اسکے خیالات کا نتیجہ ہیں گویا علم و نیکی لازم و ملزوم ہیں۔ انسان جتنا علم میں ترقی کرتا جائے گا اتنا ہی وہ نیکی سے قریب تر ہوجائے گا۔ بادی النظر میں یہ کلیہ عجیب و غریب و خلاف واقعہ معلوم ہوگا، لیکن جب ہابس (Hobbes) کے نفسیات کے اصول سے اسکی تشریح کی جائیگی

تو یہ عقیدہ آسانی سے حل ہو جائے گا۔ ہابس کا قول ہے کہ انسان دوسرے انسان پر جو کچھ رحم و انصاف یا ہمدردی یا حسن سلوک سے پیش آتا ہے وہ درحقیقت صرف ایک دھوکا ہے خود اسکے حفظ نفس وحظ نفس کا جب تک انسان اپنا کوئی فائدہ مد نظر نہیں رکھتا، وہ دوسرے انسان کے ساتھ فطرتاً نیکی سے پیش نہیں آتا۔ رحم کیا ہے؟ بقول ہابس کے وہ دوسروں کی مصیبت و تکالیف کا رنج ہے جسکا محرک صرف وہی خیال ہے کہ کہیں ہمکو بھی ایسی رنج و مصیبت سے دوچار ہونا نہ پڑے۔ ہم دوسروں کے ساتھ نیکی اور انصاف اسی امید پر کرتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے ساتھ نیکی و انصاف سے پیش آئے گا اس لئے اگر ہم یہ سوال کریں کہ دوسروں سے نیک برتاؤ کی ضرورت کیا ہے تو اسکا جواب یہ ہے کہ درحقیقت وہ ہمارے خود حفظ نفس وحظ نفس کا ایک قرض حسنہ ہے جو ہم دوسروں کو دے دیتے ہیں۔ مگر یہ تخیل انسان میں فطرتاً پیدا نہیں ہوتا۔ اور فوری جلب منفعت کا خیال اسپر اسقدر درجہ غالب آجاتا ہے کہ ایک شخص دوسرے انسان سے برائی کرنے میں فوراً آمادہ ہو جاتا ہے۔ گویا معمولی اصول اخلاق انسان کے عمل پر منحصر ہوئے نہ کہ اسکی طبیعت پر۔

ہابس نے الحاد و مادہ پرستی میں اخلاق انسانی کو جانچا ہے۔ اور اس لئے جب انسانی جذبات کی بے اعتدالی کے اندر اپنے اس نکتہ کو وہ پوری طرح حل نہ کر سکا تو اس نے آخر کار حکومت و سیاست کو ایک ازلی ذریعہ مانا ہے۔ جو انسان کو نیک عمل پر مجبور کر سکتا ہے۔ مثلاً ایک انسان اپنے کو مجبور نہیں پاتا کہ وہ خوانخواہ اپنی ذات سے اتمہید کی تکمیل کرے تاوقتیکہ اسکو یہ اطمینان نہ دلایا جائے کہ فریق ثانی بھی اپنے حصے کی تعمیل کرتا ہے۔ اور یہ اطمینان اسوقت تک میسر نہیں آسکتا ہے جب تک سوسائٹی ایسا نہ کرنے والوں کو اسباب دنیاوی سے مجبور نہ کر سکے پس ایک ایسی عالم و برتر قوت کی ضرورت ہوئی جو جماعت کی قوت و ذرائع کو ان احکام کی فرمانبرداری پر مجبور کرائے جو امن و امان کے لئے ضروری ہے اور یہ مبادیات حکومت و سلطنت ہیں۔ مگر حکومت کی تشکیل سے پہلے اخلاق کو انسان نے کس طرح برتا، یا دوسرے معنوں میں جب حکومت نہ تھی تو خلاقی احکام پر انسان نے کیسے عمل کیا۔ مجھے ہابس کے قول سے یہاں تک تو اتفاق ہے کہ مذہب نے بھی عقاب و ثواب کی صورت دیکر جب تک انسان کو عاقبت میں اپنے حظ نفس یا حفظ نفس کا اطمینان نہیں دلایا۔ اس نے انسان کو یہ تعلیم نہیں دی کہ فلاں کام کیوں نہ کرو اور فلاں کام کیوں کرو۔ گویا کہ جب تک انسان کو اپنا فائدہ نظر نہیں آتا خواہ دنیاوی ہو خواہ اُخروی وہ نیکی کیطرف رجوع نہیں ہوتا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہونگا کہ تمام اعمال نیک کی محرک انسانی خودغرضی کو کہنا انسان کی ایک قسم کی توہین ہے فلاسفر لاک (Locke) نے بھی اگرچہ ہابس کے اس قول کی تائید کی ہے کہ انسان کے عاقلانہ برتاؤ کی بنیاد خودغرضی ہے اور نیکی و بدی دراصل خود اس کے اپنے نفس کے حظ و کرب کے مرادف ہیں وہ ہابس کے مخالفین کا ہم نوا بھی ہے کہ احکام اخلاقی کی بجا آوری پر تمیز انسانی جماعت سیاسی کے باہر بھی مجبور ہے اور ادراک انسانی خود بخود اصول اخلاق کو اپنے عقل کی مدد سے مستنبط کر سکتی ہے گو کہ ہم اس تمیز کو فطری نہ کہیں۔ لاک کے نزدیک انکی بنیاد وہ احکام خداوندی ہیں جو عام قوانین معاملات معاشرت سے فائق و برتر ہیں۔ اور ایک ایسا معیار ہیں جس کی وجہ سے ایک شخص پر مستوجب سزا و جزا ہونیکا حکم لگا سکتے ہیں، اور از بسکہ یہ احکام خداوندی ہیں اس میں سزا و جزا کی پوری تشریح ہے۔ لاک کا یہ مطلب نہیں ہے کہ احکام خداوندی کسی ترتیب یا عالمانہ پیرائے میں کسی کتاب کے اندر درج ہیں۔ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ انکا وجود ضرور ہے اور اس کا وہ نہایت شد و مد سے قائل ہے۔ اوسکا قول ہے کہ یہ خیال کہ ایک برتر ذات جس میں عقل و خیر و اختیار کی انتہائی صفات ہیں اور جسکے ہم مخلوق

ہیں اور جبپر ہم بھروسہ رکھتے ہیں صحیح ہے، تو ہمارے فرائض و اعمال کی ایسی بنیاد پیدا ہو جاتی ہے جو علم اخلاق کو قابل بحث و تحقیق کر دیتے ہیں اور اخلاق کی نیکی و بدی کے معیار کے لئے ویسی ہی قابل یقین مسلمات و مفروضات پیدا ہو سکتے ہیں جیسے ریاضی میں، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ لاک کی مراد خدا کی نیکیوں سے کیا ہے، اگر اس کے معنی سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ وہ ایسی ذات ہے جس سے لوگوں کو فائدہ یا حظ حاصل ہوتا ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ نیک عمل کا آخری معیار یہی سمجھا جائے گا کہ اخلاق کے معنی ان اعمال کے ہیں جنسے لوگوں کو خوشی و فائدہ حاصل ہو۔ مگر لاک نے نیکی کا یہ معیار نہیں مانا ہے اور نہ اسنے نیکی کی کوئی مثال دی ہے۔ اس نے جو چند اخلاقی حقائق و مسلمات بیان کئے ہیں وہ مبہم سے ہیں یا اس قسم کے معمولی موضوعات ہیں کہ مثلاً کوئی سلطنت انسان کو پوری آزادی نہیں دیسکتی، یا ظلم و ناانصافی کا سوال اسوقت پیدا ہوگا جب ملکیت تسلیم کیجائیگی۔

کلارک (Clarke) اصول اخلاق کو خدا یا انسان کے مستبدانہ احکام کے ماتحت نہیں خیال کرتا لیکن لاک کی طرح وہ بھی معترف ہے کہ اخلاق کے اصول بھی ریاضی کے اصول کی طرح چند بدیہیات و مسلمات پر مبنی ہیں۔ تقویٰ (Piety) رحم و انصاف (Righteousness) و طہارت (Sobriety) اخلاق کے تین صفات اساسی ہیں، تقویٰ خدا کے لئے، انصاف و رحم مخلوقات کے لئے، طہارت اپنے حفظ نفس کے لئے۔ پہلی صفت انسان میں اسوقت پیدا ہوتی ہے جب بقول لاک بندہ اپنی ذات کو اس ذات برتر سے جو انتہائے خیر و عقل ہے اور جبپر اوسکا بھروسہ ہے مقابلہ میں لاتا ہے۔ دوسری صفت انسان کی اس خواہش سے پیدا ہوتی ہے کہ جس طرح ہم انسان ہیں اوسی طرح دوسرے انسان بھی ہیں اور جس طرح ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے دوسرے بھی ویسا ہی چاہتے ہیں، یا رحم کے متعلق یہ اصول کہ جسقدر نیکیاں دوسروں کے ساتھ کی جائیں اتنی ہی وہ بھی ہمارے ساتھ بھلائی کریگا۔ ایک ایسی صریحی و بدیہی بات ہے جو معمولی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ اور تیسری صفت تو اس اصول کے ماتحت ہے کہ کوئی شخص جس کے دماغ ہے اور دماغ کے اندر عقل ہے وہ اپنے نفس کے ساتھ کبھی برائی روا نہیں رکھ سکتا ہے۔ مگر کلارک کا یہ منشا نہیں ہے کہ جو چیز نیک ہے اسپر ہم عمل کرنے کیلئے مجبور ہیں خواہ اس عمل سے ہمارا مقصود حظ نفس یا حفظ نفس ہو یا نہ ہو کیونکہ اسکا یہ بھی قول ہے کہ انسان بسا اوقات اپنی بے عقلی سے جذبات کی بے اعتدالی سے مغلوب ہو جاتا ہے، اگر کلارک کا یہ قول صحیح مانا جائے کہ انسانی فطرت کا خاصہ نیکی پر معمول ہونے کے لئے حفظ نفس و حظ نفس کے مقصد سے مستغنی ہو۔ تو یہ سکہ اسوقت بالکل بدل جاتا ہے جبکہ ایک بدکار اپنی بدکاریوں سے ذہنی حظ و فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور ایک نیک انسان باوجود عمل خیر کے مصیبت و پریشانی میں رہتا ہے اور یہ بات قابل قبول نہیں کہ ایک شخص باوجود اپنی جان کے خطروں میں پڑنے اور بظاہر اپنی نیکیوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھانے کے نیکیوں پر عمل پیرا ہو، غرض کہ اخلاق کو مذہب سے علیحدہ رکھکر محض فلسفہ کی مدد سے سمجھنا ایسا ہی مشکل ہے جیسا الٰہیات، و تکوین و معاد و تقدیر۔

مل (Mill) نے کہا ہے کہ اگر کسی الہامی مذہب کی تعلیم اخلاقی بری اور راستہ سے دور ہے تو خواہ کسی کی طرف سے ہو ہم پر اسکا ترک کر دینا فرض ہے۔ کیونکہ ایسی تعلیم کسی حکیم و خبیر ہستی کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔ لیکن اخلاق کی عمدگی ہم کو مستحق نہیں گردانتی کہ خواہ مخواہ اسے کسی فوق العادۃ سرچشمہ کی طرف منسوب کریں۔ کیونکہ اس امر کی کوئی دلیل قوی موجود نہیں کہ جس خوبی کے دیکھنے کی

قابلیت انسان میں موجود ہے اس خوبی کو دریافت کرنے کی قابلیت اس میں موجود نہو۔ مل کے اس قول سے دو تنقیح طلب مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ آیا مذہب کے لئے ضروری ہے کہ اس میں اخلاقی تعلیم ہو، دوم یہ کہ آیا اخلاقی تعلیم مذہب کے باہر بھی ممکن ہے۔ ان مسائل پر غور کرنے سے پہلے ہم کو موجودہ مذاہب الہامی میں اخلاق کی تعلیم دریافت کرنا چاہئے۔ اور اس کے بعد اسکا خود اپنی ادراک اخلاقی سے موازنہ کرنا ہوگا۔ بعد میں ہم یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ آیا اس قسم کی اخلاقی تعلیم الہام سے باہر بھی دیجا سکتی ہے۔

ہم یہاں پر ان کتب الہامیہ کی طرف اپنی توجہ منعطف کرینگے جن کو عام طور سے ہم مسلمان مانتے ہیں۔ یعنی یہود و نصاریٰ و اسلام کی کتب سماوی۔ ہنود و بودھ، و مجوسی کے متعلق ہم کو شبہ ہے کہ آیا ان کی تعلیم الہامی کہی جاسکتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ مذہب کا اساس الٰہیات و حشر و نشر ہے اور وہ ان تینوں مذاہب میں تقریباً مفقود و معدوم ہے۔ اور مذہب کے اندر الٰہیات تسبیح کے ڈورے کی طرح ہے۔ جس کے نہونے پر تمام دوسری باتیں منتشر ہو کر اور بکھر کر اوہام میں مل جاتی ہیں۔ ہمارا یہ مقصود نہیں کہ ان مذاہب میں کوئی بات الہامی موجود ہی نہیں۔ مگر وہ اوہام کی تاریکی میں اسقدر گم ہیں کہ انکی تفتیش سعی لاحاصل سے کم نہیں یا بھس کے ڈھیر میں دانہ گندم کا فراہم کرنا۔ اور اس کے لئے نہ ہمارے پاس وقت ہے اور نہ ہم نے اس کی مداومت کی ہے۔ بائبل بھی ایک حد تک اوہام میں ڈوبی ہوئی ہے مگر نہ اسقدر جیسی کہ دوسری کتابیں۔

توریت کے اخلاقی احکام اول تو وہ احکام عشرہ ہیں جو جناب باری نے حضرت موسےٰ علیہ السلام کو کوہ سینا پر تعلیم کئے تھے گو کہ وہ عام طور سے اسقدر مشہور ہیں۔ کہ انکے لئے محض احکام عشرہ کا نام لے دینا کافی ہوگا مگر تاہم ہم اسکا ضروری حصہ جس کا تعلق اخلاق سے ہے یہاں نقل کرتے ہیں۔ (دیکھو کتاب خروج باب بستم)

۱۔ اپنے والدین کی عزت کر تاکہ دنیا میں تیری عمر دراز ہو۔

۲۔ قتل نہ کر

۳۔ زنا نہ کر۔

۴۔ چوری نہ کر۔

۵۔ دوسروں پر جھوٹی شہادت نہ دے۔

۶۔ اپنے ہمسایہ کی عورت و مال کا لالچ نہ کر۔

انجیل کی اخلاقی تعلیم وہ ہے جو جناب مسیح علیہ السلام نے اپنے "وعظ کوہ میں دی تھی" اور جسکا خلاصہ حسب ذیل ہے (دیکھو انجیل متی باب ۵ و ۶)

"پچھلوں نے کہا ہے کہ تو قتل نہ کر اور جو قتل کریگا مستوجب سزا ہوگا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ جو شخص اپنے بھائی سے بیجا غصہ کرےگا وہ مستوجب سزا ہوگا۔ اور جو اپنے بھائی کو برا کہے گا وہ سپرد جماعت محاکمہ کریگی۔ اور جو اپنے بھائی کو احمق کہے گا وہ مستوجب نار جہنم ہوگا اور اگر تو اسوقت قربان گاہ پر کوئی قربانی چڑھا رہا ہو اور تجھے معلوم ہو کہ تیرا ایک بھائی تجھ سے ناراض ہے تو اپنی قربانی کو وہیں چھوڑ اور پہلے جاکر اپنے بھائی کو منا اور پھر آکر اپنی قربانی چڑھا۔ اپنے دشمن سے جلد صلح کرلے ایسا نہ ہو کہ دشمن تجھے قاضی کے سپرد کردے اور قاضی تجھے سپاہی اور سپاہی

تجھے محبس میں ڈالدے، اور وہاں سے تو اسوقت تک نہ نکلے جب تک تو آخری پائی ادا نہ کر چکے

پچھلوں سے سنا ہوگا کہ زنا مت کر۔ اور میں کہتا ہوں کہ تو عورت کی طرف شہوت کی نگاہ سے بھی دیکھے گا تو تُو اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔ اور اگر تیری داہنی آنکھ تجھے برائی کی طرف لیجائے تو اسکو نکالکر پھینک دے۔ بہتر ہے کہ تو کانا رہے اس سے کہ تیرا سارا جسم اس کی وجہ سے جہنم میں جائے، اور اگر تیرا داہنا ہاتھ برائی کرے تو اسکو کاٹ ڈال۔ یہ بہتر ہے کہ تو ایک ہاتھ کا رہے بہ نسبت اس کے کہ تیرا سارا بدن جہنم میں ڈالا جائے۔ کیا کہا ہے کہ جو شخص اپنی عورت کو طلاق دے وہ اسکو طلاقنامہ لکھ کر دیدے۔ اور میں کہتا ہوں کہ جو شخص سوائے زنا کی علت کے اپنی عورت کو طلاق دیتا ہے اور دوسری عوت سے نکاح کرتا ہے، وہ زنا کرتا ہے اور جو مطلقہ عورت سے نکاح کرتا ہے وہ زنا کرتا ہے۔

پچھلوں نے کہا کہ سوائے خدا کے کسی کی قسم نہ کھا۔ اور میں کہتا ہوں کہ تو قسم ہی نہ کھا۔ نہ آسمان کی نہ عرش کی نہ کرسی اور نہ زمین کی اور نہ اورشلیم کی اور نہ اپنے سر کی۔ پس تیرا کلام ہاں ہاں نہیں نہیں ہو۔

تم سنا ہوگا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت۔ مگر میں تجھ سے کہتا ہوں کہ بدی کا کوئی جواب نہ دو اگر تیرے داہنے گال پر کوئی طپانچہ مارے تو بایاں گال بھی اس کی طرف پھیر دے اور جو شخص تیرا لبادہ چھینے تو اسکو چادر بھی دیدے اور جو تجھ سے ایک میل چلنے کو کہے تو اس کے ساتھ دو میل جا۔

تم نے سنا ہوگا کہ اپنے ہمسایہ سے محبت کر اور اپنے دشمن سے نفرت، اور میں کہتا ہوں کہ اپنے دشمن کو دوست رکھ اور جو تیرے ساتھ برائی کرے اوس کے ساتھ نیکی کر۔ اگر تم نے انہیں لوگوں سے محبت کی جو تجھ سے محبت رکھتے ہیں تو کیا کمال کیا، یہ تو محصول لینے والے بھی کرتے ہیں۔"

قران کے احکام اخلاقی جو آنحضرت کو شب معراج میں تعلیم دئے گئے تھے وہ سورۂ معراج میں بھی صراحت کے ساتھ ایک جگہ دئے گئے ہیں، اس کے علاوہ بعض دوسرے اخلاقی و معاشرتی احکام اور دوسرے سورہ میں پائے جاتے ہیں۔ سورۂ معراج یا اسریٰ کے احکام اخلاقی کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

"اور تمہارے پروردگار نے تم کو حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا اور اگر والدین میں کا ایک یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کو پہونچیں تو انکے آگے ہوں بھی نہ کرنا۔ اور نہ انکو جھڑکنا اور اُنسے کچھ کہنا تو ادب کے ساتھ کہنا اور محبت سے خاکساری کا پہلو انکے آگے جھکاتے رہنا اور ان کے حق میں دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار جس طرح انہوں نے مجھے بچپن سے پالا ہے اور میرے اوپر رحم کیا ہے اوسی طرح تو بھی ان پر اپنا رحم کیجیو، اور رشتہ دار اور غریب اور مسافر ہر ایک کو اسکا حق پہونچاتے رہو اور دولت کو بیجا مت اڑاؤ کیونکہ بیجا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکر ہے، اور اگر تم کو اپنے پروردگار کے فضل کے انتظار میں جس کی تم کو توقع ہو، بہ مجبوری ان غربا سے منھ پھیرنا پڑے تو نرمی سے انکو سمجھا دو۔ اور اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سکیڑو کہ گویا گردن میں بندھا ہے، اور نہ بالکل اسکو پھیلا ہی دو ایسا کروگے تو تم ایسا ہی بیٹھے رہ جاؤ گے کہ لوگ تمہیں ملامت بھی کریں گے اور تم تہی دست بھی ہو گئے، اور

افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا۔ ان کو اور تم کو ہم ہی روزی دیتے ہیں۔ اولاد کا جان سے مارنا بڑا بھاری گناہ ہے، اور زنا سے دور رہنا کیونکہ وہ بے حیائی ہے اور برا چلن ہے۔ اور کسی جان کو جسکا مارنا اللہ نے حرام کر دیا ہے ناحق قتل نہ کرنا اور جو شخص ظلم سے مارا جائے تو ہم نے اس کے ولی کو قصاص کا اختیار دیا ہے، تو اسکو چاہیئے کہ خون کے بدلے لینے میں زیادتی نہ کرے، کیونکہ واجبی بدلہ لینے میں اس کی جیت ہے، اور جب تک یتیم اپنی جوانی کو نہ پہونچ لیں انکے مال کے پاس بھی نہ جانا، اور عہد کو پورا کیا کرو کیونکہ قیامت میں عہد کی بازپرس ہوگی اور جب ناپ کے دو تو پیمانہ کو پورا بھر دیا کرو، اور تول کر دینا ہو تو ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولا کرو، یہ بہتر طریقہ ہے اور اسکا انجام بھی اچھا ہے، اور جس بات کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ ہو لیا کر، اور زمین پر اکڑ کر مت چل کیونکہ تو زمین کو نہ تو پھاڑ سکیگا اور نہ پہاڑوں کی لمبائی کو پہونچ سکے گا۔"

یہ ہے مختصر نمونہ اس تعلیم اخلاق کا جو الہام نے دی ہے، اس نمونہ کو سامنے رکھکر اگر ہم خیر و شر کا تجزیہ کریں تو ہم کو کوئی بڑی دقت واقع نہ ہوگی۔ سب سے پہلے ہم جذبات انسانی کو تین شاخوں میں تقسیم کریں گے۔ اول غضب، دوم شہوت، سوم ارادہ، پھر ان تین جذبات کے اندر انسانی اخلاق کی تشریح کا جہاں تک ہو سکے گا۔ اور یا جہاں تک مذہب کی مدد سے ہم خیر و شر کی تمیز کر سکتے ہیں، ایک نقشہ حسب ذیل مرتب کر سکتے ہیں۔ ہم نے اس ترتیب میں قرآنی اخلاق کو اپنا نمونہ قرار دیا ہے، جو تھوڑے اختلاف کے ساتھ تقریباً عام الہامی اخلاق کی طرح ہے۔ جہاں پر دوسرے مذاہب نے بعض رذائل کو فضائل یا فضائل کو رذائل کا درجہ دیا ہے۔ اسپر میں نے نشان بنا دیا ہے۔

غضب (حفظ نفس)

رذائل	فضائل
۱۔ فتنہ و قتل۔	۱۔ مقاومت جہاد و سیاست۔ ※
۲۔ کبر و نخوت	۲۔ فروتنی و عاجزی۔
۳۔ غلبت، و بدکلامی۔	۳۔ صبر و خاموشی۔
۴۔ انتقام، و تعصب۔	۴۔ عفو و انصاف۔
۵۔ ظلم و ایذا رسانی	۵۔ راحت رسانی و مروّت۔
۶۔ غدر و بغاوت۔	۶۔ اطاعت (حاکم و الدین)
۷۔ بزدلی ※	۷۔ شجاعت۔ ※

شہوت (حفظ نفس)

رذائل	فضائل
۱۔ زنا و رہبانیت۔ ※	۱۔ نکاح و حسن معاشرت۔

۲- غبن وچوری	۲- جود وسخا-
۳- سود و قماربازی- ※	۳- کسب وتجارت-
۴- شراب خواری وحرام خوری- ※	۴- قناعت-
۵- پلیدی نفس کشی- ※	۵- طہارت وتن آسانی ※
۶- ریاکاری	۶- اظہار حق-
۷- بے حیائی	۷- حیا وشرم

ارادہ یا ادراک

رذائل	فضائل
۱- جھوٹ-	۱- سچ-
۲- بغض	۲- ہمدردی ورحم-
۳- حسد	۳- رشک
۴- نفرت	۴- محبت
۵- کفر	۵- ایمان
۶- جہل	۶- علم
۷- تملق	۷- توکل

مگر ایک کام کو نیک اور ایک کو برا کہنے کا معیار الہام نے کیا مقرر کیا ہے-

اگر برائی کا معیار یہ ہے کہ وہ ایک ایسا فعل ہے جو اپنے ایک ہم جنس کو تکلیف پہونچائے یا معدوم کردے تو بعض اعمال جو یقیناً برے ہیں ان میں بظاہر یہ معیار قایم نہیں رہ سکتا- مثلاً زناکاری- اگرچہ آگے چلکر ان کے عواقب میں یہ بات پیدا ہوجاتی ہے-

ہم نے پہلے باب میں اسکا اشارہ کیا تھا کہ جذبات فطری جو خدا نے انسان میں ودیعت کئے ہیں- اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان آپس میں لڑکر تباہ نہ ہوجائیں اور اس کارخانہ قدرت کو ستیاناس نہ کردیں- گویا برائیاں دراصل ایک ایسا فعل ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مخلوقات معدوم ہوجائیں-

پروفیسر محمود علی نے اپنی کتاب دین ودانش میں وحدت شہود والوں کی طرف سے ان خیالات کو اس طرح پیش کیا ہے (دیکھو کتاب دین ودانش، برصفحہ ۲۸۶)

"بدی موجود ہونے کا سبب تلاش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بدی کو جس کا ہونا معیوب خیال کیا جاتا ہے- ان کے

نیچر کو دیکھا جائے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک بدی کے نیچر میں داخل ہے کہ وہ کسی چیز کو عدم کی طرف لے جانے کی کوشش کرتی ہے اگر زہر انسان کو مارتا ہے یا ایک انسان دوسرے انسان کو قتل کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی طاقت کے موافق اس کو عدم کی طرف لے جاتا ہے اور اگر کوئی شخص کسی کی عزت پر حملہ کرتا ہے یا اوسکے مال کو غبن کرتا ہے تو اگرچہ ظاہر میں وہ کسی چیز کو عدم کی طرف نہیں لیجاتا مگر ان چیزوں کو انکی مناسب جگہ سے ضرور معدوم کرتا ہے اور نیز اکثر حالات میں عزت کو دور کرنا یا مال چرانا انسان کو عدم کیطرف لیجانے کا باعث ہوتا ہے، اور اسکے علاوہ جسقدر روحانی یا جسمانی برائیاں انسان میں موجود ہیں ان سب میں کم و بیش کسی چیز یا کسی حالت کو معدوم کرنا پایا جاتا ہے۔ اگر اپنے اگر اپنے جرم کو چھپانے کے لئے مکر و فریب کیا جاتا ہے تب بھی اس نتیجہ کو معدوم کرنا مقصود ہوتا ہے اور علی ہذا اگر جسم میں کوئی برائی یا عیب یا مرض موجود ہے تو بھی کسی ایسے عضو یا ایسے وصف کا معدوم ہونا ہے جو جسم کے لئے ضروری یا کم از کم شان پیدا کرنے کا باعث ہے اور یہی حال تمام ان برائیوں کا ہے جو حیوانات میں پائی جاتی ہیں کہ سب انکو عدم کی طرف لے جاتی ہیں۔ اور انسان میں تو پھر بھی بعض برائیاں ظاہر میں کسی چیز کو عدم کی طرف لے جاتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ مگر حیوانوں میں اتنا پردہ بھی نہیں اور وہ سب براہ راست دوسرے کو معدوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مل کے یہ الفاظ بالکل درست ہیں کہ حیوانات کا بہت بڑا حصہ دوسرے حیوانات کو پھاڑنے اور نگلنے پر زندگی بسر کرتا ہے اور یہ بڑا حصہ بھی بڑے حیوانات میں پایا جاتا ہے جو دوسرے حیوانات سے ترقی یافتہ ہیں اور جن میں سے اکثر انسان سے مانوس ہو سکتے ہیں ورنہ چھوٹے درجہ کے حیوانات بقول مل یا نگلنے والے یا نگل جانے والے" اور نیز وہ ان ہزار ہا بلاؤں کا شکار ہیں جنکے سبب سے وہ اپنی حفاظت کے اسباب سے محروم ہوجاتے ہیں"

غرض یہ ہیں وہ برائیاں جن کے سبب کی تلاش ہے اور یہ ہے انکی نیچر کہ وہ سب عدم کیطرف لیجانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ابھی نیچر کی برائیاں شمار کرنے میں کوتاہی ہوئی ہے، کیونکہ حیوانات کے نیچے کے درجوں میں بھی بہت سے عیوب موجود ہیں، مثلاً حیوانات کے نیچے نباتات ہیں اب اگر صرف نباتات ہی مدار زندگی ہوتے تو پیدا کرنے والا صرف چند ابتدائی کیڑوں پتنگوں ہی کو پیدا کرتا جو نباتات پر بسر کر سکتے ہیں اور یہ جانوروں کا لاتعداد سلسلہ جن میں ایک کی زندگی بہت کچھ دوسرے جانوروں پر منحصر ہے ہرگز وجود میں نہ آتا اور اگرچہ ظاہر میں بہت سے بڑے حیوانات بھی صرف نباتات پر گزر کرتے ہیں مگر علمی تحقیقات ثابت کرتی ہے کہ تنفس اور بدنی مسامات کے ذریعہ سے بلکہ پانی کے ہر گھونٹ میں یہ جاندار بے شمار مخلوق کو ہضم کرتے ہیں۔ اس لئے نباتات میں جو دولت ہے اسی کو موجود مانکر سوا چند پتنگوں کے اور سب جاندار محروم رہتے۔ یہ تو نباتات کا وہ بڑا نقص ہے کہ وہ اپنے نیچر سے تمام جانداروں کو معدوم رکھنا چاہتی ہے۔ اور اس کے علاوہ بہت سے زہریلے مادہ بھی ان میں ایسے ہیں کہ جانداروں کو بہت کچھ نقصان اپہونچاتے ہیں اور بعض وقت ان کی سمیت سے بڑی بڑی تباہیاں وجود میں آتی ہیں۔ اور ان سے اتر کر معدنیات اور گیس وغیرہ عناصر کا درجہ ہے اور اگر صرف انہیں پر مدار ہوتا تو کیڑوں پتنگوں سمیت تمام جاندار مخلوق کا خاتمہ تھا اور صرف معدنیات کی وساطت سے دنیا محض نباتات کا جنگل ہوتا اور جو زندگی کی برکت اب ہے وہ تختہ زمین پر نظر نہ آتی اور جس قدر گیس وغیرہ کے پھٹنے اور معدنیات کی سمیت کے جوش مارنے سے جانداروں کا اور نباتات کا نقصان ہوتا ہے وہ اس کے علاوہ ہے اس سے اتر کر زمین اور اس سے اتر کر آفتاب کا درجہ ہے اور ظاہر ہے کہ اگر زیست کا انحصار صرف انہی پر ہوتا

تو مادہ نہایت ہی ابتدائی اور سادہ شکل میں رہتا اور یہ انواع و اقسام کی شکلیں اور طرح طرح کی زیب و زینت عالم میں نظر نہ آتی اور اس نقص کے علاوہ ان کے دیگر نقصانوں کا یہ عالم ہے کہ آفتاب کا ادنیٰ طوفان اور زمین کا ایک آتش فشاں پہاڑ تھوڑی دیر میں وہ بدی ظاہر کرتا ہے جو کوئی انسان یا حیوان ہزار برس میں بھی نہیں کر سکتا۔ آفتاب سے پرے ہمارا تجربہ چل نہیں سکتا۔ لیکن اتنا قیاس ضرور ہو سکتا ہے کہ جو درجات اس سے پہلے ہوں گے اگر صرف انہیں پر مدار ہوتا تو مادہ اور بھی سادہ اور ابتدائی شکل میں رہتا اور دنیا میں جو کچھ ہوتا وہ نہ ہونے کے برابر ہوتا اور علی ہذا ان درجات کے طوفان بھی اور ہوں گے وہ آفتاب اور زمین کے طوفانوں سے زیادہ تباہی بخش ہوں گے۔ یہ ہی مجموعہ ان برائیوں کا جو نیچر میں موجود ہیں اور شمار کرنے والوں نے محض ان ہی برائیوں کو گنا ہے جن میں ایک جاندار دوسرے جاندار کو مار دیتا ہے حالانکہ جیسا جاندار کو مارنا اوسکی زندگی معدوم کرنا ہے اسی طرح نباتات کو کھانا اور جلانا بھی انکی اپنی ہستی کو معدوم کرنا ہے اور اس لئے دونوں برے ہوے۔ اور اسی طرح کسی کو معدوم رکھنا اور ہستی کی نعمت سے بہرہ یاب ہونے دینا بھی اس سے زیادہ برا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا البتہ بولنے میں اصطلاح کا فرق ہے، زندگی معدوم کرنے کے وقت کہا جاتا ہے کہ اس نے برا کیا اور زندگی سے محروم رکھنے کا خیال کرنے پر کہا جاتا ہے کہ اس کا نقص ہے اور دونوں حالتوں میں مشترک طور پر کہہ سکتے ہیں کہ جاندار کو مار کر زندگی بسر کرنا بھی عیب ہے اور جانداروں کو پیدا کرنے کی قابلیت نہ رکھنا بھی عیب ہے۔ غرض نیچر دونوں کی ایک ہے اور اس لئے اعتراض کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ دنیا اول سے آخر تک برائیوں اور عیبوں کا مجموعہ ہے۔

مگر اس کے ساتھ اتنا اور بھی کہنا چاہئے کہ مادہ کی تمام شکلوں کو دیکھتے ہوے جسقدر ابتدا کی طرف چلے جاؤ برائی اور عیوب زیادہ ہوتے جاتے ہیں اور جس قدر انجام کی طرف آؤ بدی کے درجہ میں کمی آتی جائے گی اور نیکی یا فائدہ بڑھتا جائے گا۔ آفتاب اگر اکیلا ہوتا تو مادہ نہایت ہی سادہ شکل میں رہتا اور جاندار اور دیگر مخلوق پیدا نہ ہوتی۔ مادہ کو کسی نہ کسی شکل میں موجود رکھنا اسکا فائدہ ہے اور دیگر اعلیٰ اشکال کو پیدا نہ ہونے دینا نقص۔ مگر زمین پیدا ہونے پر نقص کم ہو گیا اور فائدہ بڑھ گیا، کیونکہ اب مادہ کو اور بھی چند پہلے سے مکمل تر شکلوں میں آنے کا موقع ملا۔ علی ہذا جمادات، حیوانات اور نباتات کے پیدا ہونے پر نقص کی کمی اور فائدہ کی زیادتی درجہ بدرجہ اور نمایاں ہوتی گئی کہ دنیا آبادی کے قریب ہوتی گئی اور پہلا سا لق و دق میدان نہ رہا، ان کے بعد بڑے حیوانات کے پیدا ہونے سے نقص میں اور بھی کمی ہو گئی کہ ان میں سے بعض مانوس ہو کر دوسری مخلوق کو خوراک کے علاوہ اور فائدہ بھی پہونچا سکے اور انہی کی وساطت سے مادہ نے آگے ترقی کی اور زیادہ لطیف شکلیں وجود میں آئیں۔ ان کے بعد انسان پیدا ہوا تو وہ اگرچہ کسی قدر جانداروں کو مارتا ہے تو کچھ جانداروں کی پرورش بھی کرتا ہے اور نیز مانوس حیوان اگر مجبور ہو کر کام دیتے ہیں تو یہ اپنی خوشی سے بھی اپنے ہم جنسوں اور دیگر مخلوقات کے کام کرنے لگا۔ اور نیز حیوان براہ راست معدوم کرنے کی کوشش کرتے تھے اور انسان کچھ کوشش براہ راست معدوم کرنے کی کرتا ہے تو بعض کوششوں میں صرف عزت یا مال چھیننے ہی پر قناعت کرتا ہے اور اس طرح بالکل معدوم کرنے سے اپنے تئیں کسی قدر دور رکھتا ہے اور پھر اس نے تہذیب میں ترقی کی تو جو برائیاں وحشی انسان کرتے تھے ان میں سے اکثر کو چھوڑتا گیا اور ہمدردی اور فائدہ رسانی میں بڑھتا گیا اور مہذب انسانوں سے بڑھکر وہ انسان ہے جو تہذیب کے ساتھ ایمان بھی رکھتے ہیں۔ کیونکہ مہذب انسان جب تک بایمان نہ ہو صرف نہیں برائیوں سے

گریز کرتا ہے جو اس زندگی میں نقصان پہونچائیں اور وہی ہمدردی کرتا ہے جو اس دنیا میں مفید ہو۔ لیکن ایماندار انسان لوگوں کو ان برائیوں سے بھی بچاتا ہے جو آیندہ زیست میں اثر کریں اور اس ہمدردی کو بھی اپنا فرض سمجھتا ہے جو اگلے جہان میں بھی فائدہ دے چنانچہ وہ مالی اور جسمانی نقصان سے بچانے کے علاوہ دوسرے کو گناہ اور کفر کی ترغیب دینے سے بھی گریز کرتا ہے اور حتی الوسع اخروی ترقی کی طرف متوجہ کر کے نیکی کی کوشش کرتا ہے مگر چونکہ سب انسان ہیں اس لئے اختیار یا بے اختیاری سے جانداروں پر بسر کرنے یا نباتات کو کھانے کے نقص سے بالکل پاک کوئی بھی نہیں۔

غرض یہ ہے نقشہ اس نقص اور کمال یا بدی اور نیکی کا جو موجودات عالم میں پائی جاتی ہے۔ اب دیکھنا چاہئے کہ نیست سے ہست کرنے کی تصویری پر عقل کے نزدیک دنیا میں نیکی اور بدی کی یہی شکل ہونی چاہئے یا کچھ اور، اور چونکہ عدم و وجود باہم متباین ہیں اس لئے معدوم کے موجود ہونے کے واسطے وہی شکل قرین قیاس ہوگی جو دنیا کے اور ضدون کے انقلاب میں ہوتی ہو۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ لوہے کو جسکا اصلی رنگ سیاہ ہے صیقل کرنے سے ایسا روشن کر سکتے ہیں کہ آئینہ کی طرح اس میں سے چہرہ نظر آئے اور بالکل سفید ہو جائے مگر اسکی شکل یہی ہوتی ہے کہ ایک زنگ آلود لوہے کو جب صیقل کرنے لگیں تو پہلے اسکا زنگ دور ہوتا ہے اور سطح کسی قدر صاف ہو جاتی ہے اس حالت میں اگر نور آئیں پیدا بھی ہوا ہے تو ایسا ناقص کہ سیاہی کچھ بھی دور نہیں ہوئی اور اگر کالا رنگ نور کے مقابل میں برا ہے تو لوہے کو اس حالت میں یہ برائی بڑی حد تک موجود ہے اس کے بعد اور رگڑا جائے تو سیاہی دور ہونا شروع ہوتی ہے مگر اس عمل کے ہر ایک درجہ میں نور بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن سیاہی بھی کم سے کم تر ہوتی ہوئی ہر وقت موجود رہتی ہے حتی کہ وہ آئینہ جیسا چمک اٹھتا ہے۔ اسوقت اگرچہ نور جہاں تک لوہے میں آسکتا تھا آگیا۔ اور اگر اس کو آفتاب کے سامنے رکھا جائے تو آفتاب کی جھلک اس میں نظر آجائے گی مگر پھر بھی لوہا لوہا ہی ہے اور آفتاب کے برابر نورانی نہیں ہو سکتا اور نیز جسقدر نور موجود ہے وہ ایسا کمزور ہے کہ آئندہ ذرا سی بے احتیاطی کے ساتھ دور ہو سکتا ہے اور لوہا سیاہ ہوتا ہوا پھر زنگ آلود حالت کو پہونچ سکتا ہے۔ اسوقت ایک بات اور بھی یاد رکھنی چاہئے کہ لوہے میں نور کا ایسی آہستگی سے در آنا اور کامل شکل میں پھر بھی موجود ہونا اور بے احتیاطی سے فوراً دور ہونے لگنا نور آفتاب کے حضور سے نہیں بلکہ لوہا چونکہ نور آفتاب کی بالکل ضد ہے اس لئے اسکی نیچر ایسی ہی ہے کہ نور کو محض اسی شکل سے حاصل کر سکتا ہے اور نور کی رفتار اسکی طرف صرف دیر آمدن و شتاب رفتن کے اصول پر ہو سکتی ہے۔

اس نظیر کو دیکھنے کے بعد مضمون کی عظمت کے لحاظ سے ایک اور نظیر کا پیش کرنا بھی ناموزوں نہ ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی جاہل علم حاصل کرنے لگتا ہے تو پہلے علم کے بے انتہا ذخیرہ میں سے بہت تھوڑا سا مہیا کر سکتا ہے اور اسمیں سے بھی کچھ یاد رکھتا ہے اور کچھ بھول جاتا ہے اس حالت میں جہالت اگر برائی ہے تو وہ علم کے آغاز پر نہایت کثرت سے موجود ہوتی ہے پھر رفتہ رفتہ علم کا سرمایہ بڑھنا شروع ہوتا ہے اور جہالت کا عیب کم ہوتا جاتا ہے۔ مگر ترقی کے ہر درجہ میں جہالت کا بقیہ حصہ کچھ نہ کچھ موجود رہتا ہے حتی کہ انسان کسی علم یا اس کی شاخ میں ماہر اور صاحب رائے ہونیکا فخر حاصل کرتا ہے مگر اسوقت بھی یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر اس علم کے متعلق اس کی دس رائیں صحیح ہوتی ہیں تو ایک رائے ضرور غلط ہوتی ہے اور ایسا کمال کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا کہ اسکا کوئی قیاس بھی غلط نہ نکلے بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کبھی اس نے کسی مسئلہ میں صحیح رائے قایم کی ہے تو دوسرے وقت پر دماغ ایسا چکرایا ہے کہ اسی مسئلہ میں غلط خیال کا حامی بنگیا ہے اور علی ہذا جس قدر کمال حاصل کرتا ہے

اگر اسکی بحث و تکرار نہ رکھے تو وہ کمال رفتہ رفتہ زوال پانے لگتا ہے حتیٰ کہ عالم ایک وقت میں بالکل کندۂ ناتراش ہو سکتا ہے اور یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ نور علم کا نقص نہیں ہے۔ کیونکہ جس مسئلہ میں ہم کسی وجہ سے غلطی دیکھتے ہیں۔ اسی مسئلہ میں وہی نور علم جو کسی دوسرے عالم میں جلوہ گر ہے اس مسئلہ کو نہایت صحت کے ساتھ دریافت کرلیتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نور علم میں بیشک مسائل کی اس حقیقت دریافت کرنے کی قابلیت ہے اور جو کچھ نقص نظر آتا ہے وہ اس لئے ہے کہ جہالت کی فطرت ہی علم سے اس قدر تناقض رکھتی ہے کہ وہ جسقدر دور ہو سکتی ہے بتدریج ہوتی ہے اور پھر بھی کسی نہ کسی شکل میں اس کا بقیہ موجود رہتا ہے اور وہی جہالت ہے جو ابتدائی درجات میں پورے طور پر نمایاں ہے اور وہی جہالت ہے جو مہارت کے وقت بھی مختلف شکلوں میں اپنی بقا کو ظاہر کرتی ہے اور علم کی برکت پر پردہ ڈالدیتی ہے۔

انکے علاوہ اور دیگر واقعات عالم میں جس قدر غور کیا جائے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک ضد کا دوسری ضد کی طرف جانا اسی ترتیب اور اسی نقص کے ساتھ ہوتا ہے۔ بس یہی کیفیت آفتاب وجود کی ظلمت عدم پر عکس ڈالنے کی ہونی چاہئے تھی اور یہی ہوئی کہ اس کی پہلی شعاع سے زنگ علم دور ہوا اور مادہ کی ابتدائی شکل وجود میں آئی۔ اور اس کے بعد جس جس حد تک عکس پڑتا گیا اس حد تک عدم کی ظلمتیں یعنی نقص اور عیب دور ہوتے گئے۔ اور وجود کی کامل سے کامل شکلیں بنتی گئیں حتیٰ کہ انسان اور کامل انسان میں آکر اس نابود نے وہ بود حاصل کی کہ آفتاب وجود کی شعاعیں اس کے اندر چمکنے لگیں۔ اور عقل و معرفت کے نور سے جسمانی اور روحانی جلوے ایسے ظاہر ہوئے کہ بعض حالات میں اس پر خود آفتاب وجود ہونے کا دھوکا ہوا۔ جس طرح مجلّا تلوار کو سورج کے سامنے رکھنے سے اس کے اندر آفتاب معلوم ہوتا ہے، چنانچہ بعض کوتاہ بینوں نے اسی کو خود ذات خدا کا ظہور سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ وہ حقیقت میں خود ذات خدا کا ظہور نہیں البتہ ایک طرح سے نور خدا کا مظہر ضرور ہے جس طرح لوہا خود آفتاب کا ظہور نہیں بلکہ اس کا مظہر ہے۔ اور یہ اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ ادھر لوہا پہلے ایسا نورانی نہ تھا اور بعد میں بے احتیاطی سے پھر تاریک ہو جاتا ہے اور ادھر انسان پہلے ایسا عارف نہ تھا اور بعد میں ذرا سی لغزش سے پھر کور باطن ہو سکتا ہے

پس یہاں بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس معدوم کی ایسی دھیمی رفتار اور اس کے اندر نقصوں کا اس قدر ہجوم اس آفتاب وحدت کا نقص نہیں بلکہ یہ عدم ہے اس لئے کہ اس کی نیچری مقتضی ہے کہ ایسی صورت سے ترقی کرے اور اس لئے ذات خداوندی کو بدی کا منبع قرار دینے کے بجائے ثابت ہوتا ہے کہ وہ محض خیر کا سرچشمہ ہے چنانچہ اس نے سب موجودات کو اس عیب سے بری کیا جو سب سے بڑھ کر تھا یعنی عدم اور بری بھی اس خوبی سے کیا کہ اب چاہے بدی کرنے والے کیسی ہی بدی کریں وہ موجودات کو موجود سے معدوم نہیں کر سکتے اور زیادہ سے زیادہ جو انکا زور چل سکتا ہے وہ ایک چیز کی محض شکل کو بدل دیتا ہے۔

اور محض وجود یا مادہ کو صرف سادہ شکل عطا کرنے پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ ترقی کا ایسا سلسلہ معدوم کر دیا گیا ہے کہ جس چیز میں جس حد تک اس بڑی بدی یعنے عدم سے بعد ہوتا گیا اسی حد تک اس میں سے عدم کا میلان کم ہوتا گیا اور اسی حد تک وجود کی مکمل تر شکل پیدا کرنے کی طاقت بڑھتی گئی حتیٰ کہ میلان عدم کم ہونے اور وجود کی طاقت بڑھنے کا سلسلہ کامل انسان میں اس حد تک پہونچگیا کہ وہ اپنی طاقت کے موافق کسی شخص اور کسی فرد کو نقصان پہونچانے کا ذمہ دار نہیں اور تمام عالم کو اپنے وجود سے فائدہ پہونچانے کی اور ہر چیز کی

اصل حقیقت کو اس کے مناسب حال سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن چونکہ اصلیت عدم ہے اس لئے عیب سے بالکل پاک ہونیکا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا، چنانچہ وہ بھی عدم کا بقیہ تھا جس کے سبب نباتات وغیرہ ابتدائی مخلوقات وجود کے بہت سے کمالات سے محروم تھی اور یہ بھی عدم کا بقیہ ہے جس کے سبب انسان جیسی اعلےٰ مخلوق کبھی امراض وغیرہ کی شکل میں اپنے اندر عدم کو ظاہر کرتی ہے اور کبھی شرارت وغیرہ کی شکل میں دوسروں کو معدوم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جس طرح وہ بھی جہالت کا بقیہ تھا جو علم کے ابتدائی درجہ میں بہت سی مسائل کو مخفی رکھتا تھا اور وہ بھی جہالت کا بقیہ ہے جو ایک عالم میں کبھی کبھی غلط رائے قایم کرنے کا سبب ہوتا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ عدم کا ظہور نباتات وغیرہ میں اور جہالت کا ظہور علم کے آغاز میں بے ارادہ ہے اس لئے کہ ابھی ارادہ کی قابلیت بھی پیدا نہیں ہوئی۔ اور جہالت کا ظہور عالم کی غلط رائے میں اور عدم ظہور انسانی افعال میں ارادہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اسوقت ارادہ کی قابلیت بھی موجود ہے مگر جب ماہر کی غلطی کو یقیناً جہالت کا نقص کہہ سکتے ہیں نہ نور علم کا قصور تو انسان کی بدی کو بھی عدم کا نقص سمجھنا چاہئے نہ کہ آفتاب وجود کا قصور۔

اب میں ان دو تنقیح طلب مسئلوں کی طرف آتا ہوں جو مل کے قول سے پیدا ہوتے ہیں یعنی آیا مذہب کے لئے ضروری ہے کہ اسمیں اخلاقی تعلیم ہو۔ دوسرے کہ آیا اخلاقی تعلیم مذہب کے باہر بھی ممکن ہے۔

ہم نے تین مذاہب الہامی کے اخلاقی تعلیم کا مختصر نمونہ دیا ہے۔ جس سے یہ صریح نتیجہ ظاہر ہو سکتا ہے کہ معمولی اختلاف وافراط و تفریط کے ساتھ ان سب مذاہب میں اخلاق کا صرف ایک ہی معیار ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک مذہب مثلاً زنا کو اچھا کام سمجھتا ہو اور دوسرا مذہب برا۔ تو اس حیثیت سے نیکی و بدی کی تعریف متقابل نہیں ہوتی بلکہ نیکی نیکی ہے اور بدی بدی۔ اور یہ دونوں معیار اخلاق کے ایسے مسلمات ہیں جنکی تشریح فلسفہ سے نہیں ہو سکی۔ ہم نے شروع ہی میں اخلاق کی تعریف میں علم تاریخ انسان کو علٰحدہ رکھ دیا تھا، ممکن ہے کہ ہم کچھ دیر کے لئے اس کو یاد کر لیں کہ انسان نے اخلاق کو اپنے متواتر تجربات سے حاصل کیا۔ اور جب جب اس کو کسی فعل سے نقصان یا تکلیف ہوئی اس کو اس نے بدی جان کر ترک کر دیا اور اپنی اولاد کو اس سے بچنے کی تعلیم دی۔ یا ہم تاریخ کی مدد سے یہ بھی ثابت کر سکیں کہ حکومت نے اجتماع اقوام کی غیر مساویانہ برتاؤ سے انصاف کرنا سیکھا اور اس پر اخلاق کی بنیاد پڑی، مگر اخلاق پر انسانی بقا و نظام فطرت کی اسقدر ذمہ داریاں ہیں کہ یہ مشکل نظر آتا ہے کہ مذہب نے انسان کی اپنی فطرت پر چھوڑ دیا ہو، اور اس کو تعلیم الہام کے ذریعہ سے نہ دی ہو۔ مذہب انسان کے موت کی وجہ سے شروع ہوا نفس نے انسان کی موت کو آخری درجہ زیست کا نہ سمجھا۔ مذہب نے آیندہ زندگی کی امید دلائی۔ اور اس کے ساتھ سزا و جزا کا سوال پیدا ہونا ضروری ہوا۔ اور جب سزا و جزا کا سوال پیدا ہوا تو اخلاق اس کا اصل سبب ہوا۔

یہ بہت ممکن ہے کہ مذہب سے باہر اخلاق کی تعلیم ہو سکے۔ مگر وہ اس حد پر جا کر ٹھہر جائے گی جہاں تک انسانی خود غرضی اسکی محرک ہوگی۔ اور مذہب اخلاق کو خود مقصود و بالذات ہونے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ قانون دنیاوی نے سیاست کے ماتحت بہت سی برائیوں سے انسان کو محفوظ رکھا ہے۔ مگر اعمال انسانی پر سوائے مذہب کے کوئی دوسری شے پوری طرح مسلط نہیں ہو سکتی اور اس لئے

یہ بھی ممکن نہیں کہ مذہب کے باہر اخلاق کی کما ینبغی تعلیم دی جا سکے آخر میں ہم کو یہ بھی بتا دینا چاہئے کہ مذہب کی خوبیوں کا معیار اس بات پر نہیں ہے کہ اس کی اخلاقی تعلیم کو نہایت آئیڈیل حیثیت اور ناقابل عمل صورت سے پیش کیا جائے جس مذہب نے انسانی جذبات کا خیال کئے بغیر اس آئیڈیل تعلیم کا وعظ دیا ہے۔ وہ کاغذ کے لئے بہت اچھے الفاظ ہیں مگر عمل میں صفر۔ ہم اسلام کو اسی لئے کامل اور نمونہ قرار دیتے ہیں کہ اخلاق کی جو اس میں تعلیم ہے وہ ایک ایسا اعتدال کا درجہ لئے ہوئے ہے جو بالکل فطری ہے اور جو دیگر مذہب میں یا تو سرے سے مفقود ہے یا بالکل اس کے خلاف پایا جاتا ہے۔ اور جو بات اسلام میں سب سے زیادہ ممتاز ہے وہ یہ ہے کہ انسانی حقوق میں اپنے نفس کے ساتھ بھی وہی فرائض ادا کرنے کا حکم ہے جو دوسروں کے ساتھ، یعنی ایسے کام جس سے خود اپنے حفظ نفس و حظ نفس ہی مقصود محض ہوں، وہ بھی اخلاق کے فضائل میں سے ہے۔ مثلاً رہبانیت، خودکشی، اور شہید و مظلوم بننے کا شوق ان سب باتوں کی اسلام میں سختی سے ممانعت ہے۔ جو ہنود و مسیحیت کے اخلاقی فضائل مانے جاتے ہیں۔

سید مقبول احمد

رمضان المبارک کا سالانہ رعائتی اعلان

ٹین کے کمزور پرزوں کی سستی گھڑیوں سے بچو اصلی فولادی مشین والی پاکٹ واچ و رسٹ واچ و الارم ٹائم پیس جنکی مجموعی قیمت سولہ (عـہ) روپیہ ہے یکمشت صرف دس ۱۰ روپیہ میں طلب کرو۔ محصولڈاک معاف۔ آپکا نام ہر گھڑی پر سنہری حرفوں میں مفت چھاپدیا جائیگا

ایک اور دینی فائدہ

نئی وضع کی نوایجاد بہت خوبصورت اور مضبوط صحیح ٹائم دینے والی ۲۲ کیرٹ گولڈ پلیٹڈ کیس کی گھڑی اپنی خوبیوں میں بڑھیا سے بڑھیا گھڑیوں سے کسی طرح کم نہیں ہے گھڑی ساز کی مدد کے بغیر مدت گارنٹی پوری کرتی ہے۔ ابتک ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہو چکی ہے۔ ہماری آزمائی ہوئی ہے۔ معہ اسٹراپ قیمت چھ روپیہ ۔ ۔ (ـــــــہ)

قیمت چار روپیہ

اگر آپ کی آنکھ سحری یا تہجد کے وقت نہیں کھلتی اور خواہش ہے کہ کسی آدمی کے بغیر خود بخود بیدار ہو جاؤ تو آپ کو یہ الارم ٹائم پیس اپنی خوشگوار آواز سے جس وقت چاہو گے ضرور جگا دیگا۔ آواز بہت بلند ہے وقت کا سچا اور مضبوط ہے۔ بحفاظت رکھا جاوے تو برسوں خراب نہیں ہوتا۔ ہمارا امتحان کیا ہوا۔ قیمت معہ محصولڈاک چار روپیہ (للعــہ)

نکل کیس سٹبنگ شیپ امتحان کئے ہوئے پرزوں کی مضبوط مشین والی بیحد خوبصورت اور صحیح ٹائم دینے کی وجہ سے مقبول عام ہے۔ ہزاروں مرتبہ کی آزمائی ہوئی آجتک اس کے متعلق کوئی شکایت نہیں آئی قیمت چھ روپیہ ۔ ۔ (ـــــہ)

ان تینوں گھڑیوں کا پورا سیٹ خریدنے والوں میں جو صاحب حلفیہ یقین دلائیں گے کہ کم از کم کلام مجید رمضان المبارک میں ختم کریں گے ان کو یہ خوبصورت حمائل شریف تحفۃً گھڑیوں کے ساتھ روانہ کی جائے گی۔ عید الفطر تک رہے گی۔

المشتہر:۔ منیجر نصیر واچ کمپنی نمبر 50 صدر بازار میرٹھ (یو پی)

لاٹری کا روپیہ

بابو گنیش بہاری کو ڈربی والی لاٹری میں پچاس ہزار روپیہ ملجانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ بیچارے میرٹھ کی میونسپلٹی میں پچیس روپیہ ماہوار کے کلرک تھے۔ بالائی آمدنی کے نام کبھی ایک پھوٹی کوڑی انہیں نصیب نہ ہوئی بڑی دقت اور عسرت سے بسر کرتے۔ اخیر مہینہ میں دو چار روپیہ ادھر ادھر سے قرض لیتے جب جاکے کام چلتا انکے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ مجھے گھر بیٹھے اتنی دولت ملجائیگی، چار مہینہ پہلے رمضان چپراسی نے زبردستی سر ہوکر ایک چونی کا ٹکٹ خرید وادیا تھا۔ اس چونی کا غم ایک دو روز رہا پھر بھول گئے، گنیش بہاری بخیل نہ تھے بخیل کیا ہوتے بخل اور خست اصل میں دولت کی ساتھی ہے۔ جسکی آمدنی روزانہ اخراجات کے لئے بھی کفایت نہ کرے روپیہ کے معاملہ میں اسکی کشادہ دلی یا تنگ حوصلگی کا اندازہ کیونکر ہوسکتا ہے۔ اتنا ضرور ہی کہ کسی تقریب میں جاتے اور وہاں صاحب ثروت لوگوں کو دیکھنے یا کسی دولت مند سے ملنے کا اتفاق ہوتا۔ تو یہ دولت کے متعلق خواب دیکھنے لگتے اور سوچتے اگر پرماتما مجھے روپیہ دیدے تو میں اپنی دولت کا تماشہ نہ بناؤں نہ میں اوسے چھپا چھپا کر رکھوں۔ امارت و ثروت زندگی کا مقصد نہ ہونا چاہئے بلکہ اسے با طریقہ زندگی بسر کرنیکا ایک ذریعہ سمجھنا چاہئے، دولت میرے نزدیک انسان کو سلیم الطبع اور صحیح الحواس بنانے میں مدد دے سکتی ہے۔ میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ دولت فسق و فجور اور لہو و لعب کی طرف مائل کردیتی ہے۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی معقول دلیل پیش نہیں کی جاسکتی اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہونگے۔ کہ مفلس اور تنگ دست لوگ فاسق اور فاجر نہیں ہوتے، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ فلاکت یا امارت پر گناہ اور بدکاری کو منحصر کرنا فطرت انسانی سے ناوقفیت کا ثبوت دینا ہے، میں ضرورت سے زیادہ روپیہ کا طلب گار نہیں ہوں مجھے خزانہ جمع کرنے کی ہوس نہیں ہے۔ میں دولتمند مرنے سے دولتمند رہ کر جینا زیادہ پسند کرتا ہوں

یہ تھے بابو گنیش بہاری کے خیالات دولت ملنے سے پہلے لیکن آج پچاس ہزار کی ملنے کے بعد ان کے جذبات عجیب طرح سے متاثر ہوئے حقیقت یہ ہے کہ جیب کو جس قدر وسعت اور کشادگی نصیب ہوتی ہے اسی قدر دل تنگ ہوجاتا ہے، دولت غلامی کی زنجیر ہے، جو دولت آسایش کا ذریعہ نہیں بنتی وہ اپنے محافظ پر حکومت کرتی ہے، یہ ایسی چیز ہے کہ اسکی زیادتی اس کی مزید افزایش کی خواہش پیدا کرتی ہے، انہوں نے سوچا جہاں تک ہوسکے اسمیں سے ایک پیسہ بھی صرف نہ کرنا چاہیے۔ چھوٹی سی رقم ہے اسکی حقیقت ہی کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دولت بے پر کے اوڑتی ہے۔

بابو گنیش بہاری کا وطن ہاپوڑ میں تھا بہت غور و فکر کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک مہینہ کی چھٹی لیکر اپنے وطن چلے جائیں اور وہاں جاکر کچھ کاروبار کریں کھیتوں کی خرید و فروخت میں لوگ لکھپتی ہوگئے یہ بہت نفع کا کام ہے گو بھاؤ گر جانے کا ڈر بھی کچھ کم نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو کیا ہوگا اس خیال سے دل میں دھڑکن پیدا ہوگئی ایسا نہ ہو کہ بیٹھے بٹھائے ساری رقم سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ ایسا کاروبار کوئی نہیں جس میں نقصان کا اندیشہ نہ ہو، اب انکا خیال لین دین کی طرف رجوع ہوا مگر اسمیں بھی اکثر لوگ نادہند نکل جاتے ہیں۔ رقعہ پرچہ، تمسک کچھ کام نہیں آتا۔ پھر کیا ہو اس دلت نے

انہیں بہت تشویش میں ڈالدیا۔ امارت اپنے مخصوص تفکرات ساتھ لاتی ہے۔ یہ بھی اس درخت کے مانند ہے جس کی ڈالیاں اپنے پھلوں کی کثرت کا بار نہیں سنبھال سکتیں اور ان کے وزن سے ٹوٹ جاتی ہیں۔

آخر گیہوں کی تجارت کا فیصلہ کرکے بابو گنیش بہاری ہاپوڑ کو روانہ ہوئے اسٹیشن پر آئے تو گاڑی تیار تھی انکے سامنے ہی ریل کا جو درجہ تھا اس میں دو آدمی بیٹھے تھے۔ اس درجہ میں بیٹھنے ہی کو تھے کہ انہیں کچھ خیال آیا فوراً وہاں سے ہٹ گئے اور اس آگے والے درجہ میں جا بیٹھے جو بالکل خالی تھا گاڑی چھوٹ گئی سوچنے لگے خیر ہوئی میں اس درجہ میں نہ بیٹھا دو آدمی تھے جو دونوں ساتھی معلوم ہوتے تھے بہت التفات کے ساتھ آپسمیں باتیں کر رہے تھے، دل میں بے ایمانی آتے کیا دیر لگتی ہے مجھے روپیہ ملنے کا حال کم سے کم میرٹھ میں سب کو معلوم ہی ہے۔ انہیں بھی ضرور معلوم ہوگا اور یہ لوگ اس سے بھی بے خبر نہ ہونگے کہ میں سارا روپیہ اپنے ہمراہ لیکر کاروبار کے ارادہ سے ہاپوڑ جا رہا ہوں ورنہ ایک ماہ کی چھٹی کیوں لیتا۔ اب انہیں یاد آیا کہ گذشتہ شب کو اسی ریل میں ایک شخص قتل کر دیا گیا تھا اور ڈاکو اسکا اسباب لیکے تھے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ انہیں اختلاج شروع ہوگیا پسینے میں تر ابور ہوگئے، سوچنے لگے میں بھی کس قدر احمق ہوں۔ گھبراہٹ میں بے سوچے سمجھے سیدھا اسٹیشن پر چلا آیا، موٹر میں چلا جاتا کرایہ تھوڑا سا زیادہ سہی مگر کچھ خطرہ تو نہ تھا، ممکن ہے وہ شخص اسی درجہ میں قتل ہوا ہو، اس خیال نے اور اوسان خطا کر دیئے۔ ممکن ہے وہ یہیں بیٹھا ہو ایسی جگہ جہاں میں بیٹھا ہوں، سنا ہے وہ بھی سارے درجہ میں تنہا تھا اور ڈاکو کھرکودے کے اسٹیشن سے سوار ہوا تھا، اسوقت بابو گنیش بہاری سخت بے چین اور مضطرب تھے انکی حالت ایسی تھی جیسے کوئی مسافر جنگل بیابان میں بھٹک کر کسی ایسے راستہ پر آلگا ہو جو رہزنوں اور لٹیروں کا تختہ مشق بنا ہوا ہو، ریل تیزی کے ساتھ جا رہی تھی اور انہیں بار بار شبہ ہوتا تھا کہ کوئی ڈاکو چلتی گاڑی میں کھڑکی کھول رہا ہے۔ انکی حالت قابل رحم تھی، سچ یہ ہے اس مصیبت کا برداشت کرنا سب سے زیادہ مشکل ہے جو کبھی رونما نہیں ہوتی، ہم اکثر بے بنیاد خطرات کے خیال سے لرز جاتے ہیں خطرات بے بنیاد سہی لیکن انکے خیال سے جو تکلیف پہونچتی ہے وہ بے بنیاد نہیں ہوتی۔ کسی مصیبت کے خیال سے ہم قبل از وقت جس قدر مضطرب ہوتے ہیں اگر واقعی وہ مصیبت پیش آجائے تو ہم ہرگز اتنے مضطرب نہ ہوں۔

اب ریل کھرکودے کے اسٹیشن پر پہونچ گئی، گنیش بہاری کے جذبات کا ہیجان اسی حالت پر تھا کچھ خفیف سا خیال آیا کہ کسی دوسرے درجہ میں چل کر بیٹھ جانا چاہیئے لیکن خدا جانے وہاں کیا پیش آئے کڑھائی سے نکلکر آگ میں گرنا کہاں کی عقلمندی ہے پھر سوچا کہ جس درجہ میں آدمی زیادہ ہوں، وہاں خطرہ کم ہے ابھی اسی تذبذب میں تھے کہ گاڑی نے سیٹی دے دی جوں ہی ریل نے حرکت کی ایک نہایت لحیم شحیم انسان پھرتی کے ساتھ دروازہ کھولکر انکے درجہ میں گھس آیا اور دوسرے کنارے پر کھڑکی کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس ایک چمڑے کے بیگ کے سوا اور کچھ نہ تھا صورت سے کوئی جاٹ یا گوجر معلوم ہوتا تھا بڑی بڑی سرخ خطرناک آنکھوں سے آگ برس رہی تھی مونچھیں لبوں سے گزر کر رخساروں کو پار کرتی ہوئی کانوں کے قریب تک پہونچ گئی تھیں اسنے بیٹھتے ہی چمڑے کے بکس میں سے نکالکر جرابیں پہنیں اور خاموش بیٹھ گیا۔

گنیش بہاری کا برا حال تھا، اب انہیں پختہ یقین ہوگیا کہ آج میری جان کی خیر نہیں یہ شخص ضرور کوئی ڈاکو ہے۔ گذشتہ شب بھی

سی نے قتل کیا ہوگا وہی لالچ اسے آج پھر لائی ہے وہی وقت ہے وہی درجہ ہے انکا دل بانسوں اچھل رہا تھا بہتیرا سوچتے تھے کہ کوئی تدبیر جانبری کی نکل آئے مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، سوچنے لگے کہ پولیس بھی کسقدر غافل ہے دنیا بھر میں تو غل برپا کر رکھا ہے کہ قاتل فرار ہوگیا یہ خبر نہیں وہ کمبخت آج پھر اسی درجہ میں موجود ہے اب وہ شخص ذرا توجہ کے ساتھ گنیش بہاری کو دیکھنے لگا، اسوقت ان کا سارا بدن لرز رہا تھا، آنکھیں ابل آئی تھیں منھ خشک ہو کر کھل گیا تھا، ایسی عجب ہیئت کس کی نظر اپنی طرف نہ کھینچ لیتی اب گاڑی پانچی سے گذر چکی تھی اور گذشتہ شب قتل کا واقعہ پانچی اور ہاپوڑ کے درمیان ہی ہوا تھا درجہ کا دوسرا مسافر ذرا سنبھل کر بیٹھا بیگ کھولکر اس میں جھانکا پھر بیگ بند کر دیا، داہنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اسوقت گنیش بہاری کے حواس قطعاً معطل ہو چکے تھے انہیں چند منٹ سے زیادہ اپنی زندگی کی امید نہ تھی وہ ہر لمحہ اس انتظار میں تھے کہ اب کوٹ کی جیب سے ہاتھ نکلا کہ میری روح کو تن سے جدا کیا جائے گا؛ وہ بے تحاشا کہنے ہی والے تھے کہ اگر تم میری جان ۔ لو تو میں لاٹری کی رقم میں سے تمہیں نصف روپیہ دینے کے لئے تیار ہوں کہ وہ شخص اپنی جگہ سے اٹھ کر انکے سامنے آبیٹھا گنیش بہاری ایک دم چیخ اٹھے "دشٹ کہیں کے تو کون ہے؟" اسنے جواب دیا کہ "بابو صاحب میں لکھنؤ شتی بیمہ کمپنی کا ایجنٹ ہوں" اس جواب کے آخری لفظ اس کے لبوں پر تھے کہ ہاپوڑ کا اسٹیشن آگیا۔

حامد اللہ افسر

چند باتوں کا خیال رکھئے

(۱) نگار کی تاریخ اشاعت ہر چند ہر ماہ کی پندرہ تاریخ ہے، لیکن عموماً وہ پہلے ہی ہفتہ میں شایع ہو جاتا ہے، اس لئے اگر ۲۰ تک پرچہ نہ پہونچے تو فوراً اطلاع دیجئے۔ ورنہ پھر دوسری کاپی مفت نہ ملسکے گی۔

بعض حضرات دوسرے مہینہ کا پرچہ ملنے پر پہلے مہینہ کا پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت کرتے ہیں، افسوس ہے کہ ان شکایات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔

(۲) نمبر خریداری خط و کتابت میں درج کرنا ضروری ہے، بعض حضرات ڈاکخانہ کے رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۱۰۴ کو اپنا نمبر خریداری سمجھتے ہیں نمبر خریداری ریپر کے اوپر داہنے جانب بلیو بلیک سیاہی سے درج ہوتا ہے اسکو ایک بار دیکھ کر کہیں نوٹ فرما لیجئے۔

(۳) طلبہ کے لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ وہ اپنے گھر یا کسی اور پتہ سے رسالہ طلب کریں۔ اسکول کے پتہ سے رسالہ طلب کرنا محفوظ طریقہ نہیں ہے۔

(۴) جن طلبہ یا لائبریریوں وغیرہ سے رعایتی چندہ لیا جاتا ہے وہ اگر میعاد خریداری ختم ہونے پر منی آرڈر نہ روانہ کریں گے تو وی۔پی ۔۔۔ی رقم کا کیا جائے گا۔

(۵) حیدر آباد کے ان خریداروں سے جہاں انگریزی ڈاک خانہ نہیں ہے، یہ استدعا کیجاتی ہے کہ حتی الامکان رسالہ رجسٹرڈ طلب کریں اور ہر سالانہ اس صرف کو بھی برداشت کریں کیوں کہ سوائے اس کے کوئی صورت وہاں حفاظت سے رسالہ پہونچنے کی نہیں ہے۔

"منیجر نگار لکھنؤ"

اِنعامُ اللہ خاں یقین دہلوی

نام ونسب وشخصیت انعام اللہ خان نام یقین تخلص نواب اظہرالدین خان بہادر مبارک جنگ دہلوی کے بیٹے نواب حمیدالدین خان بہادر کے نواسے اور حضرت شیخ عبدالاحد فارقی سرہندی کے پر پوتے تھے شجرۂ نسب انکا حضرت شیخ مجدد الف ثانی سرہندی کی وساطت سے خلیفہ دوم تک پہونچتا ہے۔ دلی میں پیدا ہوے اور نقاش اول زبان ریختہ حضرت مرزا جان جاناں مظہر کے دامن تربیت میں پرورش پائی۔ مولوی قدرت اللہ شوق صدیقی اپنے تذکرہ طبقات الشعرا میں ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

"جوانے بود خوش رو وخوشگو خوش خلق وقابل منظور نظر وتربیت کردۂ مرزا مظہر"

مولوی قدرت اللہ شوق ایک جید عالم تھے لہٰذا انکا یقین کی قابلیت کو تسلیم کرنا دلیل ہے اس بات کی کہ یقین فارسی وعربی کے فارغ التحصیل ضرور تھے مگر افسوس ہے کہ میر صاحب نے نکات الشعرا میں ان کے فضل وکمال کے مٹانے میں پوری کوشش صرف کردی ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

"القصہ پوچ پوچ چند کہ بافتہ است کہ ما وشما نیز توانیم بافت اینقدر برخود چیدہ ہست کہ رعونت فرعون پشت دست برزمین میگذارد بعد ملاقات اینقدر معلوم شد کہ ذائقہ سخن فہمی مطلق ندارد"

یقین ہی پر موقوف نہیں ہے میر صاحب کی "مشق ناز" نے "خون دو عالم" اپنی گردن پر لے رکھا ہے چنانچہ شاہ قدرت اللہ قدرت ایسے قادر الکلام کے بارے میں فرماتے ہیں" او عاجز سخن است لیکن برائے خاطر عارف کہ از یاران درست فقیر است نوشتہ شد" مگر بخلاف میر صاحب کے میر حسن اسی "عاجز سخن" کو ان الفاظ میں سراہتے ہیں۔

"مردیست از متوسلان میر شمس الدین فقیر درویش وضیع خلیق طبع رتبہ قدرش رفیع وشیوۂ معانیش بدیع سمند نفکش درمیدان فارسی وہندی چالاک وچست وتصویر بے نظیر معانیش در استخوان بندی الفاظ درست بندہ وے را یکبار در مشاعرہ لکھنؤ دیدہ ام"

اور تو اور استاد الاستاد شاہ حاتم بھی میر صاحب کی تنقید "خنجر بکف" سے ذبح ہوے بغیر نہ بچے ان کے حال میں میر صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"مردیست جاہل وتمکن ومقطع وضع ودیر آشنا نخنا ندارد و دریافتہ نمی شود کہ رگ کہن بسبب شاعری است کہ ہجو من دیگرے نیست باوضع او ہمین است"

شاہ صاحب موصوف مرزا سودا ایسے شخص کے استاد تھے پھر بھلا وہ میر صاحب کو کیا خاطر میں لاتے یہی وجہ ہے کہ میر صاحب ان سے ناراض ہیں قدرت کو "عاجز سخن" کہنا بھی کسی ایسے ذاتی مناقشے سے تعلق رکھتا ہے، اب رہے یقین تو انکی بابت اتنا سمجھ لیجئے کہ ایک نامی گرامی نواب زادہ جو ایوان شباب کی منزلوں سے گزر رہا ہو اور اس کے ساتھ ہی فضل وکمال بھی رکھتا ہو اسکی خودداری نفس کس مرتبہ

کی ہوگی میر صاحب کی نازک مزاجی کو یقین کا یہ طرزِ عمل بیشک کھٹکتا ہوگا اندریں حالات نکات الشعراء میں انہوں نے جو کچھ یقین کے بارے میں لکھا ہے اسکو ان کے جذبۂ انتقام یا رشک و حسد کا ایک کرشمہ سمجھنا چاہیے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یقین کی زندگی ہی میں انکی سخنوری کے ڈنکے بج چکے تھے چنانچہ فتح علی گردیزی جو میر کی طرح یقین کا شناسا ہے اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے۔

"صاحب تلاش معانی رنگین انعام اللہ خاں یقین پسر اظہر الدین خاں بہادر مبارک جنگ نبیرۂ حضرت شیخ مجدد الف ثانی است و نواسہ نواب جمیلہ الدین خاں مرحوم شہباز خیالش بصید معنی بلند پرواز است و ہمائے اندیشہ بر قلۂ سخن بہ پر افشانی ممتاز بے اغراق ریختہ گوئی را بر طاق بلند گزاشتہ و تخم معنی در زمین سخن کاشتہ و آنچہ از طبعش سر زدہ از فرط شیوع و حسن قبول در تمام ہندوستان بر افواہ و السنہ جاری است"

عبارت مندرجہ بالا اسقدر رفیع ہے کہ اسکے آگے میر صاحب کے خرافات کی پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رہتی۔ یہی نہیں بلکہ اس مشہور الزام کی بھی دھجیاں اڑجاتی ہیں جو یقین کے بعض معاصرین کی طرف سے ان پر عاید کیا جاتا ہے۔ اس الزام کی تشریح میر صاحب کی زبانی سنیے۔

"مردماں می گفتند کہ مرزا مظہر اور اشعر گفتہ می دہند و وارث شعر ہائے ریختہ خود گردانیدہ از قبول کردن ایں معنیش بندہ را خندہ می آید کہ ہمہ چیز بوارث میرسد الا شعر مثلاً کسے کہ بر شعر پدر خود یا مضمون او متصرف شود اورا وزد خواہند گفت تا بہ شعر استاد چہ رسد"

فتح علی کے خیالات سن چکے مگر وہ پھر غیر معروف شخص ہے لہذا تھوڑی دیر کے لئے خالی الذہن ہو کر میر صاحب کے بہنوئی میر محمد حسین کلیم دہلوی سے رجوع کیجئے دیکھئے وہ کیا کہتے ہیں انکا شعر ہے ؎

یقین کے شعروں پر ہیں بدگماں بعضے کہ اس کے نہیں　　　غلط ہے ہمنے بوجھا ہے کلام مرزا جان جاناں کو

یہ بھی واضح رہے کہ میر محمد حسین کلیم کوئی معمولی آدمی نہیں شیخ محی الدین ابن عربی کی مشہور و معروف کتاب "فصوص الحکم" کے مترجم ہونیکی حیثیت سے ان کا پایۂ علمی بہت بلند ہے اس کے علاوہ میر صاحب نے انکو نکات الشعراء میں "کلیم ریختہ" اور میر حسن نے اپنے تذکرہ میں "استاد سخن" لکھا ہے، پس ایسے جامع کمالات شخص کی شہادت جسقدر وزنی ہو سکتی ہے محتاج بیان نہیں

فتح علی اور میر کلیم کے ماسوا مصحفی کے بیان سے بھی اس الزام رکیک کی پوری پوری تردید ہوتی ہے، استاذ الاساتذہ شیخ مصحفی فرماتے ہیں۔

"در دورۂ ایہام گویاں اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ ایں جوان بود بعد ازاں تتبعش بدیگراں رسیدہ"

آخری فقرہ کی تصدیق تذکرۂ فتح علی گردیزی سے بھی ہوتی ہے۔ فتح علی ظہور کے ذکر میں لکھتا ہے

"بخوش بیانی و نیکو بیانی مشہور است و ریختہ تتبع دیوان انعام اللہ خاں یقین میکند"

عمدہ کے ذکر میں لکھتا ہے۔

"در ریختہ تتبع دیوان انعام اللہ خاں یقین می نماید شعر را بہ شستگی و رنگی می گوید"

خود یقین کو بھی اسکا دعویٰ ہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

حق کو یقیں کے یاد و برباد مت دو آخر　　　طرزیں سخن کی اس کی تم نے اڑائیاں ہیں

یقین کا ہنگامۂ فخر یہیں پر ختم نہیں ہوتا ایک دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

یقین تائید حق سے شعر کے میداں کا رستم ہے ۔۔۔ مقابل آج اس کے کوئی آسکتا ہے کیا قدرت

آگے چلکر اپنے سحر بیان اور اثر مقال کے متعلق فرماتے ہیں ؎

سخن کے سحر سے نزدیک ہے یقیں کہ کرے ۔۔۔ مرے زمین غزل دیکھ کر یہ گردوں رقص

اس کے باوجود یقین کا خیال ہے کہ انہوں نے ریختہ کی طرف کما حقہ توجہ نہیں کی اگر کرتے تو غزل کی زمین آسمان بنجاتی چنانچہ فرماتے ہیں ؎

نہ آیا سر فرد ادھر یقیں کی فکر عالی کا ! ۔۔۔ زمینوں کو وگر نہ ریختے کی آسماں کرتا !

اس بلندی پر پہونچنے کے بعد یقین کا یہ خیال ہو جاتا ہے کہ ان کے "لطف گفتگو" کو ان کے استاد کے سوا دوسرا شخص سمجھ ہی نہیں سکتا ؎

یقین کی گفتگو کے لطف کو باللہ کب کوئی ۔۔۔ بجز از حضرت استاد مرزا جان جاں سمجھے

انداز کلام بتاتا ہے کہ مرزا صاحب بھی لائق شاگرد کے لطف سخن کے معترف تھے لیکن یقین کی سعادت مندی دیکھئے وہ اگر ایک طرف اس اعتراف پر فخر کرتے ہیں تو دوسری جانب اپنی عجز طبع کے اقرار کو بھی ضروری جانتے ہیں حالانکہ ان کا ایسا کرنا صاف و صریح کسر نفسی کی مثال ہے ؎

شعر خاطر خواہ مجھ سے ہو نہیں سکتا یقیں ۔۔۔ ہو جب استعداد ناقص پیر کامل کیا کرے

جس طرح یقین اس بات کے مدعی ہیں کہ میری "لطف گفتگو" کو مظہر کے سوا دوسرا نہیں سمجھ سکتا اسیطرح انکا بھی دعویٰ ہے کہ میں اور صرف میں ہی مظہر کا صحیح قدر شناس ہوں شاگردانہ عجز و منت پذیری کے رنگ میں اس مضمون کو ادا کرتے ہیں ؎

مجھ سے تجھ کو کیا ہے جیوں یقیں حرف آشنا ۔۔۔ کون پہچانے یقین بن حضرت مظہر کی قدر

آگے چلکر اپنی افتادگی و فروتنی اور بے پایاں عقیدت و محبت کا اسطرح اظہار فرماتے ہیں ؎

سایہ بے شخص ٹھہرتا نہیں کہتا ہے یقیں ۔۔۔ آپسے مجھکو جدا حضرت مظہر نہ کرو

اس پر بھی صبر نہیں آتا تو جوش ارادت کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

جوں نماز اپنے پہ شام و صبح لازم کر یقیں ۔۔۔ حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

یقین ایک اعلیٰ درجہ کے نباض سخن ہیں مگر یہ مرتبہ انکو شاگردانہ نیاز مندیوں کی بدولت حاصل ہوا ہے اس خیال کو کلیہ کے رنگ میں بیان فرماتے ہیں ؎

طبیعت شعر کی اصلاح بن فاسد ہی رہتی ہے ۔۔۔ وہی سمجھے یقیں یہ بات جو فن سخن جانے

دیوان یقین یقین صاحب دیوان شاعر ہیں انکی زندگی ہی میں انکا دیوان اس حد تک مقبول ہو چکا تھا کہ بقول مصحفی دوسرے شعرا انکی تتبع پر مجبور ہو گئے تھے لیکن افسوس ہے کہ آجکل نایاب ہے بظاہر صرف ایک نسخہ کتب خانہ لندن میں محفوظ ہے جسے دیکھکر سید محی الدین صاحب قادری نے ایک مضمون بعنوان "دیوان یقین" جون ۲۸ء کے "نگار" میں سپرد قلم فرمایا ہے ۔ یہ مضمون نہایت سرسری طور پر لکھا گیا ہے چنانچہ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے اسمیں مرزا سودا کے یہ دو شعر یقین سے منسوب پائے ؎

بد لا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے

گر ہو شراب و خلوت محبوب خوبرد زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

مضمون مذکور الصدر میں دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ کسی قدر بدلا ہوا بھی ہے جس سے شعر بالکل مہمل ہو کر رہ گیا ہے ملاحظہ ہو۔

خلوت ہو اور شراب ہو معشوق خوبرد زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

ان فروگذاشتوں کے دیکھتے ہوئے قدرتاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یا تو قادری صاحب کی نظر سے "دیوان یقین" نہیں گزرا یا پھر انڈیا آفس میں جو نسخہ "دیوان یقین" کا موجود ہے وہ حد درجہ ساقط عن الاعتبار ہے۔

دیوان پیش نظر ہوتا تو یقین کی شاعری کے متعلق بہت کچھ معلومات میں اضافہ ہو سکتا تھا تاہم اگر قادری صاحب کی تحقیق پر اعتماد کیا جائے تو یقین کی شاعری صرف غزلوں تک محدود ہے اور ہر غزل پانچ پانچ شعر پر مشتمل ہے یہ دونوں باتیں شاید نئی ہیں جو قادری صاحب کے مضمون شائع ہونے سے پہلے پردۂ خفا میں تھیں دوسری شق سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ غالباً یقین نے اپنے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے، مجھے اتفاق سے ایک پرانی کتاب مسمی بہ "چمن بے نظیر"[1] میں یقین کی چار غزلیں دستیاب ہوئی ہیں جن میں سے تین غزلیں قادری صاحب کے بیان کردہ خصوصیت پر پوری اترتی ہیں لیکن چوتھی غزل میں بجائے پانچ شعر کے چار شعر ہیں ممکن ہے کہ ایک شعر چھوٹ گیا ہو اس خیال کو اور بھی تقویت ہوتی ہے جب "چمن بے نظیر" کی اور فروگذاشتوں پر نظر جاتی ہے اب رہی یہ بات کہ ان غزلوں کو انعام اللہ خاں یقین کا کلام سمجھنے کی کیا ضمانت ہے تو اس کے جواب میں غزلہائے مذکورہ میں سے پہلی غزل کا مقطع پیش کیا جا سکتا ہے ؎

جوں نماز اپنے پہ شام و صبح لازم کر یقین حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

یہ شعر بالتخصیص یقین ہی کا ہے جیسا کہ فتح علی گردیزی کی عبارت ذیل سے ظاہر ہوتا ہے۔

"استفادۂ سخن از افادۂ مرزا مظہر گرفتہ چنانچہ گوید":-

جوں نماز اپنے پہ شام و صبح لازم کر یقین حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

البتہ دوسری تیسری اور چوتھی غزل کے متعلق کوئی ایسا روشن ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا تاہم رنگ کلام صاف بتاتا ہے کہ یہ وہی "جوان میر" ہے جس کو خدائے سخن میر تقی میر کے محسود ہونے کا شرف حاصل ہے۔

"یقین کی شاعری" یقین کی شاعری خالص جذباتی شاعری ہے قریب قریب ہر شعر میں سادگی اور جوش اپنی پوری قوت کے ساتھ کار فرما ہے، اسپر حسن ادا اور صفائی زبان کی دلآویزیاں مستزاد چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

انجام محبت سے پشیمان ہونا عام موضوع سخن ہے یقین بھی اس سنت دیرینہ کو تازہ کرتے ہیں مگر کب جب بتوں کی نامہربانیاں نشہ غفلت سے ہشیار کر کے خدا کے وجود کا قایل کر دیتی ہیں اس پر بھی معیار طبیعت چونکہ بلند ہے لہذا اجتناب و گریز کا خیال پیدا نہیں ہوتا ؎

جو کچھ کہیں یہ تجھ کو یقیں ہے سزا تری بندہ جو تو بتوں کا ہوا کہیا خدا نہ تھا

---

[1] یہ کتاب مختلف شعرائے فارسی و اردو کے کلام کا مجموعہ ہے۔

واعظ کی پگڑی اچھالنا رندان میکدہ کا پرانا دستور ہے یقین بھی اس خوش فعلی کے مرتکب ہوتے ہیں مگر دیکھئے کس خوبی کے ساتھ کیفیت مستی کی آڑ میں پناہ لیکر اپنی معصومیت ثابت کرتے ہیں، ان دونوں شعروں میں استفہام کا لطف وجدانی ہے

خفیف مجھ سے الجھکر عبث ہوا واعظ
کہ میں تو مست تھا اسکو بھی کیا شعور نہ تھا

درد محبت کا ہر لمحہ ایک مستقل گرانجانی ہے لیکن مے مردافگن عشق کا پامرد حریف مزے لے لیکر زہراب غم کے یہ تلخ گھونٹ پیتا ہے اور باوصف امکان وہ نہیں کرتا جس سے تمام مشکلات کا دفعتاً خاتمہ ہو جائے کیا اس سے بڑھکر ایثار عاشقی کا کوئی اور درجہ خیال میں آسکتا ہے ؎

تری الفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھے ورنہ
یہ ایسا کار آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا

ہنگامۂ بہار آخر ہوا اور بخیۂ چاک گریباں کا ہنگام آپہونچا مگر یقین کا نشۂ دیوانگی خمار ہوش سے تبدیل ہونیکا ننگ قبول نہیں کرتا ؎

بہار آخر ہوئی ہے اب تو سینے دے گریباں کو
یقیں کرتا ہے کوئی اسقدر دیوانہ پن بس کر

اسقدر سنگلاخ زمین میں ایسا شگفتہ شعر کہہ لینا یقین کی قادر الکلامی کا بین ثبوت ہے۔

"داغ درون سینہ" کو ہمیشہ چشم و چراغ عشاق کا درجہ حاصل رہا ہے یقین بھی اس "شعلۂ خرمن نور" کی شادابیوں کے رہین منت ہیں ؎

یہ سینہ عشق سے محروم درد و داغ نہیں
ہزار شکر کہ یہ ملک بے چراغ نہیں

محبت کی دیوی پر عشاق کا بھینٹ چڑھ جانا متواترات شاعری میں داخل ہے لیکن یقین نے جس طرح یہ خیال نظم کیا ہے جواب نہیں ہو سکتا کیا بلحاظ شاعری اور کیا بلحاظ واقعیت۔ راقم الحروف کی رائے میں "گل سرسبد" دیوان یقین یہی شعر ہے ؎

یقیں ہار اگیا جرم محبت پر زہے طالع
شہادت اسکو کہتے ہیں سخاوت اسکو کہتے ہیں

عاشق کی روداد محبت ایک مشہد تمنا ہے ایک محشر عبرت ہے اسکو سنکر دل قابو میں رکھنا از قبیل محالات ہے اس پوری داستان کو صرف ایک لفظ "افسوں" میں اس طرح کھپا دیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی ؎

روداد محبت کی مت پوچھ یقیں مجھسے
کچھ خوب نہیں سننا افسوں ہے یہ افسانہ

عام طور پر شعرا "عشق بلا سنج" کی تصویر کا ایک ہی رخ دکھاتے ہیں مگر یقین کی نظر اس سے بالاتر ہے وہ ناکام محبت ہو سکنے کے باوجود بھی اس "مائدۂ نعمت" سے اپنے کام و دہن کو ایک حد تک لذت یاب پاتے ہیں ؎

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے
نرا برا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے

عاشق کی مہر و وفا کا اثر معکوس ایک پامال مضمون ہے لیکن یقین اسی پامال مضمون کو حسن ادا سے معجزہ بنا دیتے ہیں ؎

جور و جفا میں یار بہت ہو گیا دلیر
کرنے کو کی یہ راس نہ آئی وفا مجھے

فرمایہ عشاق کے داعیات محبت کا سدرۃ المنتہیٰ وصل معشوق ہے اور بس، لیکن ایک حقیقی عاشق کا مقام اس سے وراء الورا ہے وہ صرف رضائے معشوق چاہتا ہے خواہ بصورت وصل حاصل ہو خواہ بشکل ہجر شعر کی جسقدر تحسین کی جائے کم ہے ؎

گزرتا وصل سے گر ہجر میں دیکھے رضا انکی
محبت میں یقیں لیتا ہے نام مدعا کوئی

فلسفہ ہمہ اوست کی رو سے حسن صنم جلوۂ صمد کا آئینہ دار ہے پس جو لوگ اس "اتحاد و مجاز و حقیقت" کے رازداں ہیں وہ "باطل" کو "حق" سمجھتے ہیں اور اس "حق" سے روگردانی کرنے والے کو باطل آشنا جانتے ہیں ؎

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے
میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے

لاجواب مطلع ہے۔

دیوانۂ عشق فصل بہار آنے سے قبل ہی احتیاطاً پابہ زنجیر کر دیا جاتا ہے لیکن تبسم گل کی اثر آفرینیوں کا یہ شیدائی اس قید بیجا سے مطلق نہیں گھبراتا وہ اپنی قوت ارادی کے بھروسہ پر محافظان زنداں کو متنبہ کرتا ہے کہ تم نے مجھے قید تو کر دیا ہے مگر تمہارا یہ اصول استبداد میرے ولولوں کو دبا نہیں سکتا ؎

اگر زنجیر میرے پاؤں میں ڈالی تو کیا ہوگا
بہار آنے دو میرا ہاتھ ہے اور یہ گریباں ہے

بادصبا کے انفاس جانفزا سے کلیوں کا غنچۂ خاطر کھل جاتا ہے اور وہ کلی سے پھول بنجاتی ہیں اتنا سا مضمون ہے لیکن یقین جو ایک عاشق ستم زدہ ہیں اُن کو بادصبا کے خرام ناز میں جلوۂ قیامت نظر آتا ہے اور غنچوں کی شگفتگی میں چاک گریباں کا عالم یہ شعر حسن التعلیل کی بہترین مثال ہے ؎

نظر آتا نہیں ثابت گریباں ایک غنچہ کا
چمن پر یہ ستم کرتا ہے اے بادصبا کوئی

ناصح مشفق کا دیوانگان عشق کو پند و نصیحت فرمانا ایک قیانوسی مضمون ہے مگر یقین نے حسن ادا سے اس میں وہ تازگی پیدا کی ہے کہ باید و شاید ؎

گریباں چاک کرنے سے کسی کے کیا تجھے ناصح
ہمارے ہاتھ جانیں اور ہمارا پیرہن جانے

دوسرے مصرعہ کے تیور اس قیامت کے ہیں کہ جواب نہیں ہو سکتا۔

محبت ایک مرض جانستاں ہے اس معمولی سی بات کو کس جوش و خروش کے ساتھ بیان فرماتے ہیں ؎

مفت کب آزاد کرتی ہے گرفتاری مجھے
جی ہی لیکر چھوڑے گی آخر یہ بیماری مجھے

بتان سنگدل اپنے پرستاروں کے ساتھ ہمیشہ سے بدسلوکیاں کرتے چلے آئے ہیں لیکن یقین ایک خوددار عاشق ہیں وہ اپنی مہر و وفا کو بخون غلتیدہ دیکھکر کم حوصلگی سے نہیں بلکہ فرط غیرت سے چیخ اٹھتے ہیں ؎

اپنے بندوں کو جلا کر داغ کرتے ہیں یقیں
ان بتوں کی ضد سے ہو جاؤں مسلماں تو سہی

صرف انہیں شعروں پر موقوف نہیں ہے یقین کا قریب قریب سارا کلام یکساں شستگی و رفتگی رکھتا ہے چنانچہ مصحفی لکھتے ہیں :-

"در تمام دیوانش فصاحت و بلاغت زبان استاد جلوہ ظہور می دہد"

یہیں سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یقین کی سخن گوئی کا انکار جو انکے بعض معاصرین کی طرف سے کیا گیا اسکی تہہ میں دراصل یقین و مظہر کی "ہمزبانی" کا راز پوشیدہ ہے اور یہ بات ہر شاگرد کے لئے موجب فخر ہو سکتی ہے کہ اس کے کلام کو غیر متوقع طور پر بلند دیکھکر اس کے

استاد سے منسوب کیا جائے اس مسئلہ پر پوری وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی جا چکی ہے، اعادہ و تکرار بیکار ہے لیکن پھر بھی اتنا اور سن لیجئے کہ ملک الشعراء مرزا رفیع سودا ایسے شخص نے یقین کے ایک مصرعہ کی تضمین کی ہے جو انکے کلیات میں موجود ہے تضمین کردہ کا صرف مقطع پیش کرتا ہوں۔

مصرعہ کو یقیں تیرے سودا نے سنا تھا کل — روتا ہے وہ تب سے یوں برسے ہے گویا بادل
ہے رعد نمط نالاں بجلی کی طرح بے کل — پھر پھر کے وہ پڑھتا ہے ہاتھوں کے تئیں مل مل

"کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہئے"

اس تضمین سے ایک طرف تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بقول فتح علی گردیزی یقین کا سارا کلام انکی زندگی ہی میں فرط شیوع اور حسن قبول سے زبان زد خاص و عام ہو گیا تھا اور دوسری جانب یہ امر پایہ ثبوت کو پہونچتا ہے کہ مرزا سودا یقین کے علو منزلت کو تسلیم کرتے تھے ورنہ ایک "وزدِ سخن" کے کلام کو ہرگز قابل اعتنا نہ سمجھتے۔

مضمون کی طوالت کے خوف سے ہر شعر پر علحدہ علحدہ تبصرہ کرنیکے بجائے یقین کا جس قدر کلام مجھے بہم پہونچ سکا ہے وہ سب یکجا کئے دیتا ہوں قارئین کرام خود فیصلہ فرمالیں۔ پہلے پوری غزلیں لکھتا ہوں۔

کون کرسکتا ہے اس خلاق اکبر کی ثنا — نارسا ہے شان میں جس کی پیمبر کی ثنا
سر براہ اس منہ سے ہو سکتی ہے کب نعت رسولؐ — یا ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ کی ثنا
یہ زباں قابل ہے کب اس بات کے جو کیجئے — حضرت زہراؓ کی اور شبیرؓ و شبرؓ کی ثنا
نام احمدؐ کا مجھے انصاف سے لینا نہیں — کی ہے ساری عمر تکان ستم گر کی ثنا
جوں نماز اپنے پہ شام و صبح لازم کر یقیں — حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

خوش نہیں آتا ہے بن مجنوں ہمیں صحرا ہنوز — ان غزالوں سے ہمارا جی نہیں لگتا ہنوز
اتبلک کرتا ہے تیشہ کام میں پتھر کے دخل — مانتا ہے کوہکن کے نقش کو خارا ہنوز
مونکالے پر بھی مستی حسن کی اتری نہیں! — بھر رہا ہے مے سے یہ معشوق کی مینا ہنوز
باوجود اسکے کہ ہے زخموں کے مارے خوں میں غرق — آب خنجر کو ترستا ہے جگر میرا ہنوز
ہے یقیں کا عشق میں ہر موزبان احتیاج — اس پہ کم ہوتی نہیں اس کی یہ استغنا ہنوز

رات دن خوباں کو ہے دلہائے مفتوں کا تلاش — روز و شب لیلیٰ کو تھا در پیش مجنوں کا تلاش
اشک[1] رنگیں سے گلی کو اس نے مشہد کر دیا — مر گئے ہیں دیکھکر اس چشم پر خوں کا تلاش

---

[1] چمن بے نظیر میں یہ مصرعہ اس طرح تھا "اشک رنگیں سے گلی کو تو نے مشہد کر دیا" مگر "تو نے" یقیناً سہو کاتب ہے "اس نے" ہونا چاہئے۔

جس طرح سے ڈھونڈتے ہیں لوگ خاطرہائے شاد　　اس طرح رہتا ہے مجھکو جان محزوں کا تلاش
جی سے میرے لگ رہی ہے سانوروں کی جستجو　　جس طرح رہتا ہے افیونی کو افیوں کا تلاش
شاعری ہے لفظ و معنی سے پرے لیکن یقیں　　کون سمجھے یاں تو ہے الہام مضموں کا تلاش

کب سے زنجیر مجھ مجروح دیوانے کی عرض　　پہونچی تھی کان تک اس زلف کے شانے کی عرض
گرمی اہل بزم سے مت کر کہ میں ہوتا ہوں داغ　　شمع کی خدمت میں ہے اپنے ہی پروانے کی عرض

ہر گھڑی صحرا نشینی پہ نہ کر جرأت یقیں　　آ گئی تھی راس مجنوں کو بیاباں کی ہوا

آشنا کوئی جہاں میں کبھو بے وفا نہ تھا　　ملتے ہی تیرے مجھ سے یہ دل آشنا نہ تھا

سر سلطنت سے آستان یار بہتر تھا　　ہمیں ظل ہما سے سایہ دیوار بہتر تھا
مرا دل مر گیا جس دن سے نظارے سے باز آیا　　یقیں پرہیز اگر کرتا نہ یہ بیمار بہتر تھا

شکوہ حسن سے آنسو ہمارے سوکھ جاتے ہیں　　یقیں سورج کے آگے کب اثر رہتا ہے شبنم کا

اس قدر غرق لہو میں یہ دل زار نہ تھا　　جب حنا کو ترے پاؤں سے سروکار نہ تھا
دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوا کی ہے ہوس　　کوچۂ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا

آنکھ سے نکلے یہ آنسو کا خدا حافظ یقیں　　گھر سے جو باہر گیا لڑکا سو ابتر ہو گیا

کہوں میں کیونکہ نہ صبح بہار تجھکو کہ آج　　جو تو چمن میں نہ تھا گل کے منہ پہ نور نہ تھا
تری جدائی میں کیا کیا جفا اٹھائی ہے　　مرے جو پاس تو آتا وفا سے دور نہ تھا
برا جو کام وفا تھا سو ہو سکا نہ یقیں　　وگرنہ اس کی جفا میں تو کچھ قصور نہ تھا

بتاں خون کرکے میرا اب لگے آپس یوں کہنے — یہ کافر جیتا رہتا تو بت خانے کے کام آتا

نہیں معلوم اب کی سال پیمانے پہ کیسا گذرا — ہمارے توبہ کرنے سیتی میخانے پہ کیسا گذرا

پلو کو اپنے یقیں کی چشم گریاں پہ نہ رکھ — مت کر اے گل آبجو میں دامن رنگیں خراب

تری آنکھوں کی کیفیت کو میخانے سے کیا نسبت — نگہ کی گردشوں کو دور پیمانے سے کیا نسبت

فصل گل بھی آن پہونچی دیکھئے کیا ہو یقیں — ابکی چلتا ہے جنوں پر جی ہمارا بے طرح

سچ کہو اے بلبلو کس باغ سے آتی ہو تم ؟ — ہے ہمارے بھی تمہیں کچھ آشیانے کی خبر

تو نہ تھا حیف یقیں ورنہ دوانہ ہوتا — آج اس طرح کا دیکھا ہے پریزاد کہ بس

ناصح سے مجھکو غم نے کیا شرمسار حیف — سو بار پھٹ چکا یہ گریباں ہزار حیف

کوئی دن اور کرنے دو جنوں مجکو بہاراں میں — عبث سیتے ہو اسکو کیا رہا ہے اب گریباں میں

شکوہ جفائے یار سے کرنا روا نہیں — بندوں کو اعتراض خدا پر روا نہیں
سو سو ہے التفات تغافل میں یار کے — بیگانگی سے اس کی کوئی آشنا نہیں
کعبے میں ہم گئے نہ گیا پر بتوں کا عشق — اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

فکر مرہم کی مرے واسطے مت کر ناصح — خوب ہوتا نہیں اس عشق کا ناسور کبھو

عشق میں ملتی نہیں راحت مگر جوں کوہکن — جان شیریں دیجئے تب خواب شیریں کیجئے

یقیں کے واقعے کی سن خبر وہ بدگماں بولا
یہ دیوانہ تو ایسا کچھ نہ تھا بیمار کیا کہئے

شب ہجراں کی وحشت کو تو اے ہمدرد کیا جانے
جو دن پڑتے ہیں راتوں کو مجھے تیری بلا جانے

خطا ہے مفت مر کر بار کیوں دیجے رقیبوں کو
ہماری ہم سے پوچھو کوہکن کی کوہکن جانے

یقیں جاتا رہا گر بلبلوں کے ساتھ جانے دو
کوئی اس بے مروت دلکو اپنے پاس کیا رکھے

پڑیں پتھر الٰہی اس محبت پر کہ ہو بیکس
مرے فرہاد اور پرویز شیریں کو اٹھا لائے

یقیں ہوا مجھے قطرے سے اشک کے معلوم
نہ اٹھ سکے جو کوئی آنکھ سے گرا ہووے

جسکو منظور ہو مرنا اسے جینا ہے عذاب
ہے دم پاک مسیحا دم شمشیر مجھے

نہ نکلا کام کچھ اس صبر سے اب نالہ کرتا ہوں
مری فریاد رہی شاید مری فریاد کو پہونچے

پریشاں خاک سے اٹھتا ہے سنبل اس سے ظاہر ہے
کھلے ہیں موے لیلیٰ اتبلک ماتم میں مجنوں کے

دعا ستوں کی کہتے ہیں یقیں تاثیر رکھتی ہے
الٰہی سبز جتنا ہے جہاں میں تاک ہو جائے

کیا دل ہے اگر جلوہ گر یار نہ ہووے
ہے طور سے کیا کام جو دیدار نہ ہووے

ناصحو! یہ بھی کچھ نصیحت ہے
کہ یقیں یار سے وفا نہ کرے

جوان مرگی افسوس ہے کہ عین عنفوان شباب یعنی پچیس ۲۵ سال کی عمر میں یقین کو چرخ کج مدار کی نظر کھا گئی ورنہ بقول حسن گل رعنا

اگر جیتے رہتے تو میر ہوں یا مرزا کسی کا چراغ ان کے سامنے نہیں جل سکتا تھا۔

تمام تذکرے متفق ہیں کہ یقین اپنے باپ کے ہاتھ سے مارے گئے مگر کیوں مارے گئے، اسکو مرزا علی لطف صاحب تذکرہ گلشن ہند کی زبانی سنئے، مارے جانے کو اس کے بعضے تو یوں نقل کرتے ہیں کہ احمد شاہ بادشاہ کے "عہد سلطنت میں بہ سبب کسی حرکت نامعقول کے کہ وہ صادر ہوئی تھی یقین سے، باپ نے اس کے اسکو قتل کیا اور نعش کو اسکی دریا میں بہادیا، اور بعضے کہتے ہیں کہ ارتکاب اس عمل شنیع کا گذرا تھا اسکے باپ کے دھیان میں کہ وہ ممنوع ہے جمیع ادیان میں، یقین نے اس باب میں اکثر متنبہ کیا، ایکدن اس نے خفا ہو کر اس بیچارے کا جی ہی لیا"

تذکرہ گلشن ہند ترجمہ ہے علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرہ گلزار ابراہیمی کا لیکن اکثر ناقص ہے چنانچہ خط کشیدہ فقرے کو بار بار پڑھ جائیے صحیح مطلب سمجھ میں نہ آئے گا تا وقتیکہ علی ابراہیم خاں خلیل کی عبارت پیش نظر نہ رکھی جائے، علی ابراہیم خاں لکھتے ہیں۔

"گویند بعہد احمد شاہ بادشاہ بنا بر امر نا ملائے کہ از یقین صادر نمی شد او را پدرش کشت و بدریا انداخت و بعضے گویند پدرش ارتکاب امرے داشت کہ ممنوع جمیع ادیان بود او منع می نمود پدرش برآشفت و خونش بریخت"

مگر مولوی قدرت اللہ شوق نے شق دیگر کا ذکر نہیں کیا ہے انکے الفاظ یہ ہیں "در عین عنفوان جوانی پدرش نسبت بقصورے کہ از یقیں بوقوع آمدہ باشد کشت یقین است کہ مغفرتش شدہ باشد" یہ دونوں متباین بیانات اسقدر مبہم ہیں کہ انکو پڑھکر کسی قطعی نتیجے پر پہونچنا دشوار ہے، البتہ مولوی عبد الغفور نساخ نے سخن شعرا میں حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھا دیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"احمد شاہ بادشاہ کے عہد میں پچیس (۲۵) برس کی عمر میں تہمت زنا پر اپنے والد ماجد کے ہاتھ سے بے گناہ شہید ہوئے" نساخ کا تذکرہ اگرچہ بہت بعد کو لکھا گیا ہے مگر یقیناً انہوں نے یہ روایت کسی مستند ماخذ لی ہوگی اب ان تمام واقعات پر ایک تنقیدی نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً عشق خونریز کا سفاک ہاتھ یقین کی ہلاکت کا باعث ہوا، خود یقین نے اپنی قبل از وقت موت کی پیشینگوئی ایک شعر میں عمداً یا اضطراراً اس طرح کی ہے ؎

یقیں مارا گیا جرم محبت پر زہے طالع — شہادت اس کو کہتے ہیں سخاوت اسکو کہتے ہیں

اس شعر کے مفہوم سے بھی یہی مستنبط ہوتا ہے کہ یقین کسی "ترک جنگجو" کے گھایل ضرور تھے اس کے علاوہ عام رنگ کلام بھی یہی بتاتا ہے واقعہ بہر حال کچھ ہو یہ مسلم ہے کہ یقین کی جواں مرگی اور بے گور و کفن لاش ایک عظیم حزنیہ ادبیہ سے تعبیر کرنیکے لائق ضرور ہے۔

اولاد یقین کے سلسلۂ ذکر میں کسی صاحب تذکرہ نے انکی اولاد کے متعلق ایک حرف نہیں لکھا اور حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کے زمانے تک تذکرہ نویسی کا معیار ہی اس قدر بلند نہ تھا جو ان خفیف خفیف باتوں کی طرف توجہ کرتے، لیکن مجھے ورق گردانی کی کافی محنت اٹھانیکے بعد سخن شعرا سے ان کے تین بیٹوں کا حال معلوم ہوا (۱) صمصام الدین خاں احمد، (۲) مرید حسین خاں مرید (۳) مقبول نبی خاں مقبول

ان تینوں کی بابت نساخ نے جو کچھ لکھا ہے وہ انہیں کے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

۱۔ احمد تخلص صمصام الدین خلف انعام اللہ خاں یقین مقیم دہلی سپاہی پیشہ تھے" اسکے بعد یہ دو شعر انکے نقل کئے ہیں ؎

تن کو جلائے یا کر تو آنسو بہائے شمع — بنتی نہیں یہاں تجھے بن سر کٹائے شمع

فراق گلرخاں میں کھا کے داغ آہستہ آہستہ   کیا سینہ کو میں نے اپنے باغ آہستہ آہستہ

۲- مرید تخلص مرید حسین خاں دہلوی خلف انعام اللہ خاں یقین"

درد اور غم میں مبتلا ہیں ہم!   دردمندوں کے پیشوا ہیں ہم
مثل سیماب کیوں نہ دل تڑپے   آئینہ رو سے اب جدا ہیں ہم
تھا وعدہ سرِ شام کا پھر اب ہے سحر کا   ڈرتا ہوں کہیں صبح کی پھر شام نہو وے

۳- مقبول تخلص مقبول نبی خاں خلف انعام اللہ خاں یقین شاگرد نثار اللہ خاں فراق

دسترس رکھتا ہے جو پائے حنائی تک رقیب   یا الٰہی ہاتھ اوس کا ہووے شانے سے جدا
نہ لگا تو گلے سے یار افسوس!!   آہ افسوس صد ہزار افسوس!!
ہر بات میں رکاوٹ طرز ادا تو دیکھو   ہر آن میں بگڑنا مہر و وفا تو دیکھو

یوں تو یہ سب شعر اپنی اپنی جگہ صفائی اور برجستگی کا ایک اچھا نمونہ ہیں لیکن مرید حسین خاں مرید کا یہ شعر طرز یکتائی دارد ؎

تھا وعدہ سرِ شام کا پھر اب ہے سحر کا   ڈرتا ہوں کہیں صبح کی پھر شام نہو وے

تلامذہ گلستانِ سخن، آثار الشعرائے ہنود، اور سخن شعرا میں لالہ شیو سنگھ ظہور دہلوی اور لالہ حصیارام عمدہ کشمیری (برادر راجہ دیارام پنڈت کشمیری مقیم دہلی) کو یقین کا شاگرد لکھا ہے لیکن تذکرہ فتح علی گردیزی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ یقین کے متبع تھے نہ کہ شاگرد، ممکن ہے فتح علی کا بیان صحیح ہو اور بعد کے تذکرہ نویسوں نے اس اتباع کو شاگردوں کا مرادف سمجھا ہو، معنوی حیثیت سے دیکھا جائے تو اتباع بھی ایک قسم کی شاگردی ہے بس کوئی وجہ نہیں ہے کہ ظہور و عمدہ کو یقین کا شاگرد نہ کہا جائے اسکے ساتھ ہی اگر انکے "طرزِ سخن" کا اتباع دوسرے شعراء نے بھی کیا ہے جیسا کہ مصحفی کے بیان اور خود انکے ایک شعر سے ظاہر ہوتا تو بلاشبہ ان سب کو بھی یقین کا خوشہ چین ماننا پڑیگا اور یہی وہ بات ہے جو میر و مرزا کی کمالات کو بھی "نقشِ ثانی" کا درجہ دینے کی سفارش کرتی ہے، اس سلسلے میں یہ روایت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ میر مظفر حسین ضمیر استاد مرزا دبیر نے جب مرثیے کے میدان میں علم جدت و اجتہاد بلند کیا تو صاف صاف کہدیا ؎

دس میں کہوں سو میں کہوں یہ درد ہے میرا   اس طرز میں جو کہدے وہ شاگرد ہے میرا

ظہور و عمدہ کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

ظہور

بہا اس بے بہا کا کیا بھلا ہو   سرِ قاتل یہ جس کا خوں بہا ہو
چشمِ گریاں حُسن سے معمور ہے   چاندنی برسات کی مشہور ہے

عمدہ

خراب مجھکو نہ کر جان آشنا ہوکر   برا کرے ہے کسو سے کوئی بھلا کہہ کر
مرے تابوت پر حاجت نہیں پھولوں کی چادر کی   کہ میری نعش پر وہ سرو گل اندام ہو وے گا

فتح علی گردیزی ظہور کو مشہور "خوش بیان و نیکو بیان" بتاتا ہے اور عمدہ کے حال میں لکھتا ہے کہ اسکے شعر "شستہ و رفتہ" ہوتے ہیں۔

حالاتِ عُرفی پر ایک نظر

اور

عبدالمالک صاحب سے تاریخی اختلاف

مجھے عبدالمالک صاحب آروی کے مضمون "خواجہ محمد شیرازی متخلص بہ عُرفی" مطبوعہ نگار بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۸ء سے عُرفی کے بعض حالات زندگی کے متعلق اختلاف ہے مجھے اس میں کئی غلطیاں محسوس ہو رہی ہیں، اپنی تحقیقات کی بنا پر انہوں نے درست تحریر فرمایا لیکن میں ایسی کتاب کی مدد سے انکے دعاوی کو باطل ٹھہرا رہا ہوں جو ۱۰۲۴ھ ہجری میں پایۂ تکمیل کو پہونچی ہے اسکا مؤلف ایک مخلص شخص تھا اور جہاں تک ممکن تھا اس نے پوری تحقیق سے کام لیا۔ جن اشخاص کا ذکر اس نے اپنی کتاب میں کیا ہے اگر وہ ان سے خود ملا جس سے نہ مل سکا انکے قریبی رشتہ داروں سے حالات پوچھ کر اپنی کتاب میں درج کئے ہیں۔ عُرفی کے ذیل میں لکھتا ہے کہ اس کے خالو شمس الانام شیرازی سے حالات دریافت کر کے لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب کا نام میخانہ ہے مؤلف کا نام ملا عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی ہے، یہ نایاب مگر گراں قدر صحیفہ قریباً ناپید ہو چکا تھا خدا بخشے مولینا شبلیؒ نعمانی مرحوم کو، انہوں نے پہلے پہل اس کتاب کا ذکر اپنی مشہور عالم تصنیف شعر العجم کے ماخذ بیان کرتے ہوئے کیا، اسکے بعد میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز انارکلی لاہور نے بہ تحشیہ و تصحیح ایم محمد شفیع صاحب ایم۔ اے معلم عربی ۱۹۲۶ء میں شایع کی۔ اب یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی لاہور کے امتحاناتِ السنۂ شرقیہ کے درجۂ منشی فاضل میں شامل ہے۔ میری تحقیق کا دار و مدار اسی پر ہے۔

نام و نسب مؤلف میخانہ فرماتے ہیں "حقیقتِ حالِ آں عندلیبِ گلستانِ نکتہ پردازی از خالو او شمس الانام نام شیرازی استماع نمودہ دریں اوراقِ پریشاں تحریر نمود" اس سے ظاہر ہے کہ عُرفی کے حالاتِ زندگی کے متعلق کسی مصنف کے قول کو شمس الانام کے قول پر تفوق و ترجیح نہیں۔ مؤلف میخانہ فرماتے ہیں۔ "کہ چوں ایں ضعیف مآلِ حالِ آں طوطیٔ شکر مقال ازو استفسار نمود گفت:۔ نام پدر عُرفی خواجہ بلوی شیرازی است و ایں خواجہ بلوی در شہر مذکور در دفتر خانہائے شاہی بشغلی، از اشغال حکام آنجا اشتغال داشت و نام پسرش محمد حسین بود در صغرِ سن درمیانِ مردم بمولانا صیدی ملقب گردید یاران شیراز باو عُرفی تخلص دادند" اس سے معلوم ہوا کہ عُرفی کا نام جمال الدین نہیں جیسا کہ عام تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے اور نہ خواجہ سید محمد ہے جیسا کہ عبدالمالک صاحب نے تحریر فرمایا۔ عُرفی کے والد کا نام خواجہ بلوی ہے۔ نہ کہ زین الدین علی علوی۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عُرفی پہلے صیدی تخلص میں کرتا تھا عُرفی تخلص دوستوں نے تفویض کیا نہ کہ والد کے عہدے کی نسبت سے۔

ولادت و وفات عُرفی ۹۶۶ھ ہجری میں بمقام شیراز پیدا ہوا۔ اور ۱۰۰۲ھ ہجری میں بمقام لاہور وفات پائی "ملا عبدالنبی" لکھتے ہیں ہنوز سنش بچہل نرسیدہ بود کہ در لاہور در سن اثنی و الف عالم فانی را وداع کرد روزے از روزہا بتقریبے بہ زدِ وزارت پناہ عزت

ومعالی دستگاہ میرزا نظام قزوینی کہ بخشی و دیوان دار العیش کشمیر بود شنیدم کہ گفت در وقتے کہ خبر بیماری عُرفی بسمع مبارک جمجاہ انجم سپاہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ رسید من حکم فرمود تا من ببالین او رفتہ بر مآل احوالش اطلاع یابم و حقیقت مُردن و زیستن او را بعد از ملاحظہ بعرض رسانم چوں نزدیک او شدم دیدم کہ کار بر او دشوار شدہ و نفسش بہ شمار افتادہ پرسیدم چہ حال داری جواب داد کہ "دو ششش و ششش پنج" اس سے بستر مرگ کی رباعی کی تصدیق نہیں ہوتی) "ہر چہ از و پرسیدم ہمیں گفت۔ برگشتہ حقیقت حالِ آں شکستہ پر و بال را بعرضِ ایستادگان بارگاہ دولت جلال رسانیدم۔ بادشاہ و اعیان دولتِ قاہرہ از استماعِ ایں مقدمہ تعجب بسیار نمودند" تقی کاشی نے بھی یہی تاریخ وفات دی ہے۔

ورود و قیام ہند

چودہ پندرہ سال کی عمر میں ہو کہ عُرفی خوبصورتی میں بدر البدر تھا اسکا حسن ضرب المثل لیکن بیس۲ سال کی عمر میں چیچک نکل آئی جس سے کریہ منظر اور بدشکل ہو گیا۔ یہاں تک کہ لوگ اس سے نفرت کرنے لگے عُرفی شکستہ دل و آزردہ خاطر ہو کر ہندوستاں چلا آیا جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے:- "درسن چہاردہ و پانزدہ حسن او قبول تمام عیاری بہم رسانیدہ بود و آبلہ نکشیدہ چوں سال عمرش بہ بست رسید آبلہ سرشاری برآورد و بعد از انقضائے اشتداد و استخلاص ازاں مرض تغیرے در چہرہ او بہم رسید چنانکہ ہر کس کہ او را میدید تنفر میکرد و مولوی ازیں مقدمہ بغایت آزردہ و درہم بود .... بنابراں از وطن خروج کردہ بہ ہندوستاں کہ خانہ نشوونمائے نکتہ سنجاں و دار العیار خردمندان است آمد"

عبد الملک صاحب کی تحقیق کے مطابق مولانا عُرفی ۳۵ برس کی عمر میں ہندوستان آئے اور ایک سال ہند میں رہے الیکن مؤلف میخانہ کے قول سے اس کی تردید ہوتی ہے بلکہ بموجب روایت خالوی عُرفی شمس الانام شیرازی" بیس یا اکیس سال کی عمر میں ہندوستان آنا ظاہر ہوتا ہے۔ اس حساب سے عُرفی کا قیام ہندوستان پندرہ سولہ سال ثابت ہوتا ہے نہ کہ ایک سال۔

تقی کاشی (سبز رنگ صفحہ ۳۷) نے لکھا ہے کہ عُرفی ۹۹۲ھ ہجری میں براہِ دریا ہندوستان آیا۔ پہلے احمد نگر ٹھہرا ہفت اقلیم میں لکھا ہے کہ عُرفی "اوّل از ابتدا از بندر جرون بدکن وارد شد دراں ولایت اور احیانکہ باید دست نداد لاجرم متوجہ ہند شد"۔ ان تمام واقعات کو ہم اس طرح تطبیق دے سکتے ہیں۔ کہ عُرفی بیس اکیس سال کی عمر میں دکن آیا ہو سات آٹھ سال وہاں رہ کر شمالی ہند کی طرف متوجہ ہوا ہو بنابریں مورخین کو عرفی کے قیام ورود ہند کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہو۔ لیکن یہ محض قیاس ہی قیاس ہے، قیام دکن پر ہم کوئی روشنی نہیں ڈال سکتے۔ دکن میں وارد ہوا ہو یا نہ ہو یہ تو قطعی طور پر درست ہے کہ وہ ۹۸۶ یا ۹۸۷ ہجری میں شمالی ہندوستان میں وارد ہوا۔

استخوانِ عُرفی کا نجف اشرف پہونچنا

مؤلف میخانہ لکھتا ہے" ملک الشعرائے خراساں میرزا فصیحی در سنہ ہزار و بیست و ہفت شخصے از ہرات بلاہور فرستادہ بود کہ استخواں مولوی مغفور را بہ مشہد مقدس برند۔ دہ روز قبل از انکہ کس میرزا فصیحی بلاہور رسد میر صابر صفاہانی کہ یکے از یاران ایں خجستہ فرجام است استخوانِ عُرفی را بہ نجف اشرف روانہ ساختہ بود، سبحان اللہ نتیجہ ایں بیت او

---

۵ یہ شخص جہانگیر اور شہجہاں کے عہد میں پہلے صوبہ گجرات کا واقعہ نویس دیوانی تھا۔ پھر کل دکن کا واقعہ نویس مقرر ہوا۔ میر نے تمام عمر تاہل اختیار نہ کیا اور تجرد میں نیک نامی سے زندگی بسر کی ۱۰۴۱ھ ہجری تک وہ واقعہ نویس دکن تھا، نہیں معلوم اس کے بعد کب تک جیا۔

بظہور پیوست ؎

بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم
اگر بہند بہیر انیم دگر بہ تتار

عبدالمالک صاحب تحریر فرماتے ہیں :- "میر صابر اصفہانی جو عیات بیگ طہرانی مخاطب بہ اعتماد الدولہ وزیر ہند کی خدمت میں تھے وزیر موصوف سے اجازت حاصل کر کے عُرفی کی لاش لاہور سے نکالکر خراسان کی راہ مشہد لے گئے اس حصول سعادت کے دو ماہ بعد نجف اشرف میں پہونچایا - اور وفات کے تیس سال بعد عُرفی کے ریزہ ہائے استخواں کو حصار نجف اشرف کے باہر جو جگہ "حصار" اور "مقام صاحب الامر" کے درمیان واقع ہے اور جس کو بحیرہ کہتے ہیں - دفن کر دیا - ملا رونقی ہمدانی نے اس کی تاریخ کہی ؎

رقم زد از پئے تاریخ رونقی کللم — بہ کاوش مژہ از ہند تا نجف آمد

عبدالملک صاحب کی تحقیق کے مطابق میر صابر صفاہانی خود استخوان عرفی کو نجف اشرف لے گئے - لیکن مؤلف میخانہ لکھتا ہے اس کام کو میر صابر کے ایک آدمی نے سر انجام دیا - نیز عبدالملک صاحب وفات کے تیس سال بعد استخواں کا نجف اشرف پہونچنا لکھتے ہیں - لیکن ملا عبدالغنی فخر الزمانی قزوینی سنہ ۱۰۲۷ ہجری وفات کے پچیس سال بعد لاش کا نجف اشرف پہونچنا لکھتے ہیں ملا رونقی کی جس تاریخ کو عبدالمالک صاحب نے بطور سند پیش کیا ہے ہم اسی کو ان کے دعوی کے بطلان میں پیش کرتے ہیں، یہ تاریخ بقول عبدالملک صاحب عرفی کے ریزہ ہائے استخواں کے نجف اشرف پہونچنے کی ہے جو بقول انکے اس کی وفات کے تیس سال بعد کا واقعہ ہے - عبدالمالک صاحب نے عرفی کی وفات سنہ ۹۹۹ھ میں واقع ہونا لکھی ہے - رونقی کی تاریخ سے ۱۰۳۲ نکلتے ہیں - اگر اس سے تیس ۳۰ نکال دئے جائیں، تو ۱۰۰۲ رہ جاتے ہیں - اور یہی تاریخ وفات عُرفی ہے - گویا عبدالمالک صاحب نے مؤلف میخانہ کی تائید کر کے اپنے دعوی (وفات عُرفی سنہ ۹۹۹ ہجری) کی تردید کر دی -

فضل حسین تبسم

علم فراست الید

یعنی ہات کی لکیروں، ہات کی ساخت، انگلیاں اور ناخن دیکھکر ایک شخص کی سیرت و اخلاق پر حکم لگانے اور اس کے ماضی و مستقبل کے حالات معلوم کرنیکا علم اگر آپ ایک ہفتہ کے اندر سیکھنا چاہتے ہیں تو یہ کتاب ہم سے طلب کیجئے جو نہایت سہل زبان میں، نقشوں وغیرہ کی مدد سے آپ کو بہت جلد اس فن کا ماہر بنا دیگی. قیمت ایک روپیہ عہ علاوہ محصول

"مینیجر نگار لکھنؤ"

خزینۂ حسن و عشق

کہا جاتا ہے کہ عشق کا تعلق دل سے ہے اور چونکہ دل میں صرف خون بھرا ہے، اس لئے عشق ایک خونی داستان ہے۔ آئیے خون کی سیر خوردبین میں کریں عاشق کا خون تو فالتو مانا ہی گیا ہے دیکھیں کہ اس کے خونِ دل کے ایک قطرہ میں کیا کیا رازِ حسن و عشق پنہاں ہیں .... واہ کیا دلکش نظارہ ہے ....!

اس ناچیز قطرۂ خوں میں تو قارون کا خزانہ دفن ہے۔

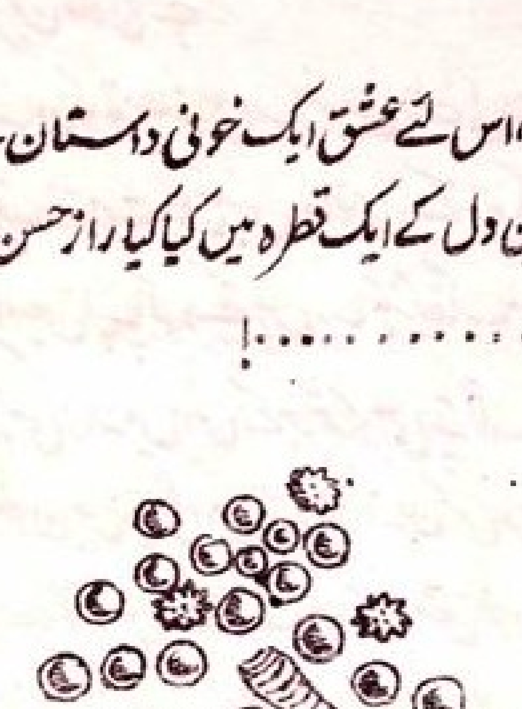

خون کا نظارہ خوردبین میں۔

لاکھوں گول گول ٹکیاں جابجا نظر آتی ہیں گویا کہ دینار سرخ ہیں کہ ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ ان کو اگر متاعِ عشق تصور کیا جائے تو حضرتِ عاشق کا دل دولتِ عشق سے مالا مال ہے۔

انہی سرخ ٹکیوں کے درمیان چند سفید اور تاروں کی طرح جگمگاتے ہوئے ذرات بھی نظر آتے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ یہ کسی مہروش کے حسنِ دلنشین کی تابش ہے جو عاشق کے خونِ دل کے ذروں میں سرایت کر گئی ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ غرض یہ کہ دولتِ عشق اور کسی کے حسن کی چمک دمک نے اس قطرۂ خوں میں کچھ ایسی دل آویزیاں پیدا کر دی ہیں کہ:۔

اجزائے خوں کی سیر حسیں گر کیا کریں
ہر خوردبیں کے نیچے ہمارا لہو رہے

یہ تو خون کا نظارہ ایک شاعر کے نقطۂ نظر سے تھا دیکھیں کہ سائنس داں اس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ انکے نزدیک یہ گول گول سکہ ہائے عشق صرف ایک قسم کے سرخ رنگ سے بھری ہوئی ٹکیاں ہیں جنکا کام یہ ہے کہ تازہ ہوا یعنی آکسیجن (Oxygen) کو ہمارے بدن کے ہر گوشہ میں پہونچائیں اور زہریلی ہوا یعنی کاربونک ایسڈ گیس (Carbonic acid gas) کو ان گوشوں سے نکالکر جسم کے باہر لیجائیں۔ سائنس کے اس خیال کے مطابق عاشقوں کا آہ سرد بھرنا اور ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لینا نہایت مفید ہے۔ کیونکہ جتنی لمبی اور گہری سانس کھینچی جائے گی اتنی ہی زیادہ تازہ ہوا خون میں شامل ہوگی اور خراب ہوا جسم سے باہر نکل جائیگی اس لئے عاشقوں کو طولِ شبِ فراق اور آہوں کی اذیت کا گلا فضول ہے، یہ تو ان کے حق میں نعمتِ غیر مترقبہ ہیں۔ ہاں لحاف یا جاڑ

میں منہ لپیٹ کر آہیں بھرنا بیشک بہت نقصان دہ ہے کیونکہ خراب ہوا بار بار پھیپھڑوں میں داخل ہو کر خون کو خراب کر دیگی۔ ڈاکٹر رائے دیتے ہیں کہ علی الصباح کھلے میدانوں میں لمبی اور گہری سانسیں لینے سے تندرستی پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ عاشقوں کیلئے صرف اتنی نصیحت کافی ہے کہ جب کھلے میدانوں اور باغوں وغیرہ میں تشریف لیجائیں تو کسی کی جفاؤں اور بیدردیوں کا خیال کر لیا کریں، بس یہی انکی جسمانی تندرستی کے لئے بہترین علاج ہے۔

معمولی انسان کو تو مصنوعی سانسیں لینے کی ضرورت ہے، لیکن عاشق کی ہر آہ فطری اور حقیقی معنوں میں گہری ہوا کرتی ہے۔ خون کے سفید ذرات سائینس دانوں کے نزدیک ہمارے جسم کے سپاہی ہیں جو ہر مرض کے جراثیم پر نہایت سختی سے حملہ آور ہوتے ہیں اور اکثر انہیں پسپا کر دیتے ہیں۔ سائنٹیفک معلومات کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہر مرض کے جراثیم برابر دریافت ہو رہے ہیں۔ عشق بھی ایک مرض ہے ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں اس کے جراثیم کا بھی پتہ لگ جائے اور اس مرض لا دوا کی دوا بھی دستیاب ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ سفید ذرات کی جتنی زیادہ تعداد خون میں ہوگی اسی قدر کم انسان کسی مرض میں مبتلا ہوگا، اور برخلاف اس کے ان کی تعداد جتنی کم ہوگی اتنی ہی جلد انسان امراض کا شکار ہو جائے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ عاشق خون کے سفید ذروں کی کمی کی وجہ سے بہت جلد مرض عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور معشوق ان ذروں کی زیادتی کی وجہ سے عرصہ تک اس کے اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کا پتہ تو جب ہی چل سکتا ہے کہ عاشق و معشوق کے خون کا مقابلہ خوردبین میں کیا جائے۔ لیکن کس عاشق کو اتنی تاب ہے کہ وہ کسی کے خون کا تصور بھی کر سکے، چہ جائیکہ اس کا تماشہ خوردبین میں دیکھے۔

احتشام علی۔ ایم۔ ایس سی

تذکرۂ خندۂ گل

یعنی

ظریف شاعروں کا تذکرہ

نہایت تیزی کے ساتھ چھپ رہا ہے اور یقین ہے کہ فروری کے اخیر تک مکمل ہو جائے گا۔ جن حضرات نے دو روپیہ ۸ آنہ پیشگی بھیجدئے ہیں۔ ان کی خدمت میں طباعت کے بعد بذریعہ رجسٹری فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

اب بھی موقعہ ہے کہ آپ دو روپیہ ۸ آنہ بھیجکر نصف قیمت میں اسے حاصل کر لیں۔ ورنہ طباعت ختم ہونے پر چار روپیہ ۸ آنہ سے کم اسکی قیمت نہ لیجائیگی، اور محصول علاوہ اسکے ہوگا۔ کیونکہ اسکا حجم ۵۰۰ صفحات سے زیادہ ہوگا۔

اردو زبان میں یہ پہلا تذکرہ ہے جسمیں تمام قدیم و جدید ظریف شاعروں کے حالات، ان کے لطائف اور انتخاب کلام کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

"مینیجر نگار، لکھنؤ"

شیخ الشیوخ حضرت نصیر الدین محمود گنج معانی رحمۃ اللہ علیہ

محمود نام، نصیر الدین کنیت، چراغ دہلی اور گنج معانی لقب اور عرف ہے۔ والد کا نام شیخ یحییٰ تھا، وہ عبد اللطیف یزدی کے بیٹے تھے۔ اصلاً خراسانی ہیں۔ نسب کے متعلق اختلاف ہے، بعض نے سید لکھا ہے، بعض فاروقی کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک خالدی ہیں لیکن ان سب میں بقابل ترجیح نسبت فاروقی ہے۔ سیادت و خالدیت محض دعوی ہے، کوئی ثبوت نہیں، اور نسبت فاروقی حضرت فاروق اعظم تک منتہی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت کے حامل بھی کئی تذکرے ہیں، اور سب میں قریب قریب ایک ہی سلسلہ نسب مرقوم ہے، مثلاً سیرت المحمود۔ روضۃ الاخیار۔ احوال الاتقیا، تذکرۃ الاولیا، سیر السالکین۔ اقتباس الانوار اس وقت پیش نظر نہیں

شیخ عبد اللطیف کے اسلاف قدیم الایام سے خراسان میں رہتے تھے اور یہ خاندان تقریباً ایک صدی سے اپنی نجابت و شرافت، تقویٰ و طہارت، اور علم و دولت کی وجہ سے بہت مشہور و ممتاز تھا۔ لیکن بدقسمتی سے عبد اللطیف کو وہ زمانہ ملا جب دولت مٹ چکی تھی، اور ساز و سامان رخصت ہو کر صرف ایک علم باقی رہ گیا تھا، جو اس فلاکت و بیچارگی کے زمانہ میں رفیق و ہمدم تھا۔ مصیبت کے مارے وطن سے نکلے، گھر سے نکلتے ہی بلاؤں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ جو کبھی دو قدم پیدل نہ چلے تھے، اب انھیں کوسوں اور منزلوں چلنا پڑا، جن عورتوں نے کبھی گھر کے باہر قدم نہ رکھا تھا، انھیں صحرا نوردی کرنی پڑی، اور یہ مصیبت زدہ خاندان معیشت کی تلاش میں برسوں آوارہ و سرگرداں رہا۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ قسمت کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا، ان مصیبت زدوں کی قسمت کا لکھا بھی کسی طرح نہ مٹا، جہاں گئے بدقسمتی ساتھ گئی۔ اور بخت کی نارسائیوں نے ہر جگہ ناکامی کا منھ دکھایا۔ ان پیہم ناکامیوں سے اکثر کی ہمتیں ٹوٹ گئیں، اور وہ تارک الدنیا ہو گئے۔ لیکن جو شیر دل اور قوی بازو تھے وہ اپنی طلب میں سرگرم رہے[1]، اور لیلائے کامیابی سے ہم آغوش ہوئے۔

انھیں خوش نصیب جوان ہمتوں میں شیخ عبد اللطیف بھی تھے۔ جو آٹھ نو برس تک در در کی ٹھوکریں کھاتے رہے مگر کسی ناکامی سے دل تنگ نہ ہوئے، اسی سعی و تلاش میں انھوں نے ہندوستان کا رخ کیا، اور لاہور پہونچکر قسمت آزمائی میں کامیاب ہو گئے یہاں زمانے نے پوری مساعدت کی، برے دن پلٹ گئے، قسمت جاگی اور تین چار مہینہ میں عبد اللطیف کا طالع چمک اٹھا[2]

اس کی تقریب اسطرح ہوئی کہ ایک جاگیردار کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک نیک ذات ادیب اور فارغ التحصیل علم کی ضرورت تھی۔ یزدی حسن اخلاق اور علم و فضل کی دولت سے مالا مال تھے جو کچھ پڑھا تھا سب ازبر تھا، معقول و منقول میں یکساں فرمانروائی تھی اس پر مستزاد یہ کہ زبان و قلم کے بھی مالک تھے، جہاں بیٹھ جاتے اپنا رنگ جما دیتے۔ جاگیردار سے ملاقات ہوئی تو وہ ایک ہی صحبت میں دلدادہ ہو گئے، دل کھول کر اس جوہر کامل کی قدر کی، سارے گھر بار کا مالک بنا دیا، اور اپنی بیٹی عقد میں دیکر پندرہ ہزار کی جاگیر داماد کے نام لکھدی

---

[1] روضۃ الاخیار ۱۲ [2] سیر السالکین ۱۲

مگر یزدی بلند فطرت تھا، اس نے اپنی نظر ہمیشہ اونچی رکھی، وہ جاگیرداری کے عیش و آرام میں بھی سپاہی بنا رہا۔[۱]

خدا نے اس رشتہ کو بہت کامیاب کیا، اور یحییٰ نامی ایک بچہ پیدا ہوا جو صورت و سیرت کے لحاظ سے عجیب چیز تھا۔ یزدی کو یحییٰ سے بہت محبت تھی، ذرا بھی ماتھا گرم ہو جاتا تو وہ تلملا جاتے، نہ کھانے کا ہوش رہتا نہ پینے کا، وہ معمولی معمولی بیماریوں میں کئی کئی راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتے تھے۔[۲] لیکن اس دیوانی محبت کے ساتھ یہ تیور بھی دیکھو کہ تعلیم کی طرف سے ایک دم کو غافل نہ ہوئے، اور پیار ایسا نہ کیا کہ بیٹا مرزا پھویا بن جائے۔[۳] انھیں اپنی مصیبت کے دن یاد تھے، وہ چاہتے تھے کہ یحییٰ کو خراب عادتوں سے بچائے رکھیں، قلم و تلوار کا دھنی بنائیں، رزم و بزم، عیش و مصیبت، تنگی و فارغ البالی سب کے مزے چکھا دیں۔[۴] لیکن خدا کو ان کی یہ آرزو آرزو ہی رکھنی منظور تھی، وہ یحییٰ کی تربیت مکمل کرنے سے پہلے چل بسے، اسوقت یحییٰ کی عمر کل بارہ برس کی تھی۔[۵]

مگر یحییٰ کی ماں امام ربیعہ کی ماں تھی۔ شوہر کے مرتے ہی وہ مرد بن گئیں، اور بیٹے کی تعلیم و تربیت کا انتظام ایسے سلیقہ سے اپنے ہاتھ میں لیا کہ لوگ حیران رہ گئے۔ دور دور سے استاد بلوائے، جہاں ضرورت ہوئی ساتھ لے گئیں، امتحانوں میں خود جاکر دیکھا، دن کا پڑھا ہوا سبق رات کو اپنے سامنے بٹھا کر یاد کرایا۔ اس کے علاوہ شہ سواری، نیزہ بازی، تیر اندازی، تحریر و تقریر سب چیزیں سکھائیں، اور پچیس برس کی عمر میں یتیم یحییٰ کو قابل رشک نوجوان بنا دیا۔ سیرت المحمود میں یحییٰ کی زبانی لکھا ہے کہ ان کی والدہ نے ان کی تعلیم پر ساٹھ ہزار روپیہ سے زیادہ خرچ کیا تھا۔ کئی کئی استاد رات دن گھر پر رہتے تھے، اور فنون سپہ گری کے ماہروں کی خدمات اسطرح حاصل کی گئی تھیں کہ ان کے کل مصارف برداشت کئے جاتے تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد یحییٰ ماموں کی دعوت پر فیض آباد آگئے۔ ماموں کا کاروبار دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ وہ ایک معزز عہدہ دار اور بہت بڑے زمیندار تھے۔ والدہ نے اُن کی لڑکی سے ان کا پیام دیا، شادی ہو گئی، اور اس سنگم سے امرت کی وہ جوئے سلسبیل نکلی جس نے اپنے خاندان کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔ والدین نے اس کا نام محمود رکھا[۶] لیکن وہ نصیر ملت و دین تھا۔ فرشتوں نے آسمانوں میں اور انسانوں نے زمین پر اسے چراغ دہلی اور گنج معانی کے نام سے پکارا۔

کہتے ہیں فولاد جب کسی اچھی دھات سے مل جاتا ہے تو اسکی خوبیاں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں۔ شیخ محمود ماں کی طرف سے سید اور باپ کی طرف سے فاروقی تھے۔ سیادت و فاروقیت جب ملی تو سنگریزہ لعل شب تاب بن گیا۔ محمود کو اپنے نسب پر بہت ناز تھا، کہتے تھے یہ اللہ کی ایسی رحمت ہے کہ شکر ادا نہیں کر سکتا، اور نہیں چاہتا کہ اس نشہ سے ایک دم کو بھی میرا دماغ خالی ہو۔ جسطرح ددھیال نجابت و شرافت میں مشہور و ممتاز تھی، اسی طرح ننھیال بھی اپنی عالی نسبی میں ضرب المثل تھی۔ یہ لوگ صرف نام کے سید نہ تھے، بلکہ حقیقی اور عملی سید تھے تیغ و قلم کے ساتھ صداقت، پاکبازی، زہد، تقویٰ، اور حیرت پسندی ان کی شہادت کا اصلی رنگ روپ تھا۔

تذکرہ نویسوں نے بچپن کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ستارۂ بلندی اسی زمانہ سے چمکنے لگا تھا۔ پاکی اور

---

[۱] سیرت المحمود و اخبار الاولیا ۱۲ [۲] اخبار الاولیا ۱۲ [۳] حکایات الصالحین ۱۲ [۴] سیرت المحمود ۱۲ [۵] حکایات الصالحین ۱۲ [۶] سیرت المحمود ۱۲

نفاست کا بہت خیال تھا، عبادت کے بیحد شائق تھے، کھیل کود سے بھاگتے، اور پڑھنے لکھنے کی طرف دوڑتے تھے۔ اسپر ذکاوت حاضر جوابی، فراست اور حافظہ و گویائی نے اس مجموعۂ خوبی کو اور قیامت بنا دیا تھا۔ جس استاد سے پڑھتے وہ عاشق ہو جاتا۔ مولانا عبدالکریم شیروانی کہتے ہیں۔ میری ساری عمر پڑھنے پڑھانے میں گزری، لیکن ایسا ہونہار بچہ میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ نصیر الدین نے پڑھانے کا مزہ کھو دیا، اب ایسا عالم نہیں ملیگا۔ آپ یہ باتیں سنتے تو خدا کا شکر ادا کرتے، اور کہتے کہ اس کا مستحق میں نہیں ہوں بلکہ وہ ہے جس نے مجھے یہ دولت عطا کی ہے۔ اسکی عنایت شامل حال نہ ہوتی تو میں کیا کر سکتا تھا۔ [۱]

اخبار الاولیا میں لکھا ہے کہ شیخ محمود نے صرف تین مہینے میں سارا قرآن حفظ کر لیا تھا، اور حافظہ اتنا قوی تھا کہ اپنا سبق یاد کر کے اوروں کے سبق بھی یاد کر لیتے تھے۔

مولانا فخر الدین زرادی سے شیخ یحییٰ کے بہت گہرے مراسم تھے، ان کے بلانے پر محمود، دہلی بھیجدیے گئے، یہاں انھوں نے سات آٹھ برس رہکر مختلف علوم کی تحصیل و تکمیل کی اور نہایت محنت و جانفشانی سے درجۂ تبحر حاصل کیا۔ اس سلسلہ میں جن شیوخ علم سے استفادہ کیا، ان میں مولانا فخر الدین زرادی، مولانا علاء الدین نیلی، مولانا فخر الدین گیلانی، مولانا رکن الدین خجندی، مولانا وجیہ الدین پائلی، مولانا نجیب الدین بھکری، مولانا جلال الدین اودہی، مولانا صدر الدین نادی اور مولانا شمس الدین یحییٰ کے نام بہت نمایاں ہیں۔ آپ نے مولانا یحییٰ کی تعریف میں عربی میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا، اس کا ایک شعر یہ ہے [۱]

سالت العلم من احیاک حقاً   فقال العلم شمس الدین یحییٰ

ایک دفعہ مولانا شمس الدین یحییٰ کے ساتھ حضرت محبوب الٰہی سے ملنے گئے، انھوں نے پوچھا کچھ پڑھتے ہو بولے ہاں فی الحال مولانا سے ابن سینا کی اشارات پڑھ رہا ہوں۔ انھوں نے بعض مشکل مقامات پوچھے، آپ نے کہا اگرچہ مولانا پوری طرح سمجھا چکے ہیں، اور مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں ہے، لیکن ہنوز قلب مضطرب ہے، شیخ نے ایک مختصر سی تقریر میں پہلے ابن سینا کا نظام فلسفہ سمجھایا، پھر ان مقامات کی ایسی واضح تشریح کی کہ آپ مطمئن ہو گئے۔ اس ملاقات کے بعد سے آپ اکثر ان کی خدمت میں جایا کرتے تھے [۲]

اخبار الاولیا میں یہ آمد و رفت نسبت بیعت کی وجہ سے لکھی ہے، لیکن یہ غلط ہے۔ اس سفر اور اس ملاقات کو بیعت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس زمانہ میں آپ لیلائے علم کے سودائی تھے۔ اور رات دن اسی کے لئے سرگرداں رہتے تھے۔ البتہ اس ملاقات سے آپ حضرت محبوب الٰہی کے علم و فضل کے معتقد ہو گئے تھے۔ تذکرۃ الفضلا میں لکھا ہے:-

"اثبات را اعتقاد در حق او راسخ شد، بعد از مدتے مرید شد و بمرتبۂ کمال رسید"

باوجودیکہ آپ کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں گزرتا تھا، تاہم آپ کے دوست بکثرت تھے۔ آپ جب دہلی آئے تو یہ دنیا بالکل اجنبی تھی، لیکن چند روز میں یہ اجنبی دنیا وطن بن گئی اور بیگانے یگانے ہو گئے۔ کوئی مشہور و ممتاز مدرسہ ایسا نہ تھا جس کے طالب علم

---

[۱] روضۃ الاخیار، سیرت المحمود، حکایات الصالحین [۲] سیرت المحمود [۳]

اسیر محبت نہ ہوں۔ جو ہر قابل کو دیکھکر استاد بھی دوستوں کی طرح ملتے تھے[۱]، اور دہلی کے تمام علمی حلقوں میں آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ سیرت المحمود میں لکھا ہے کہ دہلی کے جن جن مدرسوں میں پڑھا تھا، ہر جگہ تمام شاگردوں کے لئے استاد کے جانشین رہے۔

اُسی زمانہ میں وعظ و غلبہ کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا اور رسائل و مقالات بھی لکھتے رہتے تھے۔ یہ رسائل اتنے مقبول ہو گئے تھے کہ اکثر مدرسوں میں داخل درس ہو گئے تھے۔ لیکن جب زندگی میں انقلاب پیدا ہوا تو دنیا بدل گئی اور تمام رسائل جمع کر کے آگ کے نذر کر دئیے[۲] کہ

ایں جملہ قیل وقال پامال شود!

عہد طالب علمی کی ان عالمانہ شہرتوں نے آپ کو دربار شاہی تک پہونچا دیا تھا خصوصاً شہزادہ محمد تغلق سے دوستانہ مراسم ہو گئے تھے۔ یہ اسکی طالب علمی کا زمانہ تھا بے تکلف ہو کر ملتا اور نیاز مندی سے پیش آتا تھا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے آپ سے کچھ استفادہ بھی کیا تھا۔ جب آپ دہلی سے رخصت ہوئے تو مشایعت میں وہ بھی شریک تھا اور بہت سے تحفے تحائف ساتھ کئے تھے[۳]۔

اس علم و فضل اور شہرت و عزت کے ساتھ جب آپ وطن پہونچے، تو دور و نزدیک دھوم مچ گئی، اور سارا فیض آباد ایک رات کے لئے شہر چراغاں بن گیا۔

دو تین برس وطن میں رہکر مزید تحصیل علم کے لئے بیرون ہند کا سفر کیا، کئی برس مصر اور عراق و حجاز میں پھرتے رہے۔ مختلف شیوخ سے حدیث کی سماعت کی۔ حجاز و یمن اور نجد کے ادیبوں سے علم ادب حاصل کیا۔ شافعی، حنبلی، مالکی طریقوں کے فقہاء سے بزنگ محدثانہ فقہ کا درس لیا۔ پھر ایران، کاشغر، سمرقند، بخارا، فرغانہ وغیرہ کا سفر کرتے ہوئے براہ افغانستان ہندوستان میں آئے۔ یہاں اس زمانہ میں سلطان محمد تغلق سریر آرائے ملک و دولت تھا، اس نے سنا تو آپ کو دہلی ہوتے ہوئے جانے کی دعوت دی اور وزارت دینی کا عہدہ پیش کیا۔ آپ تیار ہو گئے اور یہ ٹھیرا کہ وطن سے واپس ہو کر جائزہ لے لیں گے۔ مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا، اور اس سے زیادہ معزز بنانا چاہتا تھا۔ جس کے آگے یہ سربلندی ادنی ترین پستی کی بھی حیثیت کی چارہ گری سے وطن آ کر پے در پے ایسے صدمات و حوادث میں مبتلا ہوئے کہ پریشان ہو گئے، یکایک والدہ کا انتقال ہو گیا نو برس کا ایک بچہ مرا، والد پر فالج گرا، بیوی بیمار ہو گئیں[۴] اور اندر باہر کے تمام کاروبار درہم و برہم ہو گئے۔ ان وجوہ سے مجبوراً جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اعلیٰ عہدے کیلئے انتخاب ہی بڑی چیز ہوتا ہے، گو قلمدان وزارت ہاتھ میں نہ آیا، مگر یہ بات ساری مملکت میں پھیل گئی، ہزاروں نظروں کا مرکز بن گئے، دیوان خانہ دربار عام بنا رہتا، لوگ خدمت میں حاضر ہونا فخر سمجھنے لگے۔ علما کی گردنیں بھی دست بوسی کے لئے جھکنے لگیں اور اک دنیا اس شمع پر پروانہ وار ٹوٹ پڑی۔ تذکرۃ الفضلا میں لکھا ہے:-

"ہر جا کہ رفتے مخلوق جوق جوق بخدمت شریفش حاضر گشتے، بیشتر مردم تلمذ بوے انتخاب می کردند، و علما بدست بوسی کردا مفتخر و مبتہج می بودند"

جاگیر کا انتظام ایسی خوش اسلوبی سے کیا کہ سال بسال آمدنی میں اضافہ ہونے لگا، ہر چھٹے مہینے سارے علاقہ کا دورہ کرتے،

---

[۱] حکایات الصالحین و تذکرۃ الفضلا ۱۲ [۲] سیرت المحمود ۱۲ [۳] سیرت المحمود و تذکرۃ الاتقیا ۱۲ [۴] سیرت المحمود ۱۲

آمد خرچ کا حساب کتاب لین دین کے معاملات اپنی نگرانی میں رکھے، مقدمات کے فیصلے خود کرتے تھے[1]۔ قابل تعریف بات یہ بھی کہ باوجودیکہ زندگی بھر ان باتوں سے علیحدہ رہے، تاہم اسطرح کام کیا جیسے کوئی بہت ہی آزمودہ کار کرتا ہے۔ بعض خوش عقیدہ تذکرہ نویسوں نے اس حسن انتظام کو بھی خرق عادت لکھا ہے، ان کے خیال میں آپ ولی مادر زاد تھے[2]۔

لیکن علم کا فدائی ان مصروفیتوں میں بھی خدمت علم سے نہیں رہا، اس کا جوش ان کاروبار میں بھی شباب پر رہا، اور نشر علوم و معارف، انہدام بدعت و قیام شریعت کے فرائض اسی طرح انجام پاتے رہے جس طرح عہد فراغ میں انجام پاتے تھے، سیرت المحمود میں لکھا ہے:۔

"غالب وقت در افادۂ علم گزشت، وکار حفظ شریعت نیز انجام پذیرفت"۔

مولوی احمد علی نامی ایک صاحب آپ کے سخت مخالف تھے، اس مخالفت میں بدنام کرنے کی کوئی تدبیر ایسی نہ تھی جو انھوں نے نہ کی ہو۔ اخلاق و ایمان کے ذلیل سے ذلیل الزام لگائے، اور بری سی بری صورت میں پیش کیا، لوگوں میں طرح طرح کی افواہیں اڑائیں۔ لیکن۔ انھوں نے جتنی برائیاں کیں سب انھیں کے خبث نفس کا ثبوت بن گئیں۔ ہر اک کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو گئے۔ مگر اس جلن میں بری فطرت بد سے بدتر ہو گئی۔ گالیاں دیتے تھے۔ جان کے درپے ہو گئے۔ شیخ محمود فضائل اخلاق کا پتلا تھا، وہ یہ باتیں سنتا تو افسوس کرتا۔

ایک روز اتفاق سے مولوی صاحب ایک جگہ مل گئے، اور حسب عادت نہایت ترشروئی سے پیش آئے، لیکن گرم لوہے کو ٹھنڈا لوہا کاٹ دیتا ہے، یہ ترشروئی بھی خندہ پیشانی سے کٹ گئی۔ جسکی قدر اندازیاں ساری دہلی کو نخچیر بنا چکی ہوں، اس کے لئے ایک دل کو اپنے فتراک میں باندھ لینا کیا مشکل تھا۔ دیکھتے ہی ان کی طرف بڑھے اور لطف و محبت کے انداز سے چند باتوں میں وہ جادو کیا کہ مولوی صاحب قدموں پر گر پڑے، بولے: "مولانا! میں بہت شرمندہ ہوں، خدا کے واسطے مجھے معاف کر دیجئے"۔ آپ نے انھیں گلے سے لگا لیا، اور کہا "میرے عزیز! اس کا غم نہ کرو، میرا دل صاف ہے"[3]۔

غرض امیرانہ شان و شوکت اور عالمانہ جلال و جبروت کی یہی انجام سے بے خبر زندگی تھی جس کی آغوش میں آپ آسودہ راحت تھے، اور کوئی نہ جانتا تھا کہ مستقبل قریب میں کیا ہونے والا ہے۔ ہر غرض مند، ہر وابستۂ دامن، ہر ذلہ ربائے خوان کرم کی یہی دعا تھی کہ خدا اس در کو ہمیشہ قائم رکھے۔ مگر قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے، اس کے آگے شاہ و گدا بے بس ہیں، نہ کسی کا زور اسکو بدل سکتا ہے۔ نہ کسی کی عاجزانہ دعائیں۔ جب وقت آیا تو تقدیر پوری ہوئی اور پیدا و پنہاں معشوق نے ماسوا کی محبت دل سے نکال کر اپنی لگن لگا دی، آنکھوں کو اپنا جلوۂ عریاں دکھا کر تڑپا دیا۔

بظاہر اس انقلاب کی ابتدا جس واقعہ سے ہوئی وہ بہت معمولی ہے۔ ایک دفعہ شیخ محمود کہیں جا رہے تھے، وابستگان دامن دولت کا ہجوم ساتھ تھا، ناگاہ ایک مجذوب سے ملاقات ہو گئی، اس نے کہا "مولانا! کہاں جاتے ہو؟" لیکن محمود نے سُنی اَن سُنی کر دی، انھوں نے پھر پوچھا: "مولانا کہاں جاتے ہو؟" لیکن محمود نے اب بھی کچھ جواب نہ دیا، اور منھ موڑے آگے بڑھ گئے۔ یہ دیکھکر مجذوب غیظ و غضب سے بھر گیا، آنکھیں انگارے کی طرح سرخ ہو گئیں، چہرہ تمتما اٹھا، رونگٹے کھڑے ہو گئے، جسم سے آگ کے شرارے نکلنے لگے، اور وہ ایک رعد آسا آواز کے ساتھ

[1] سیرت المحمود و اخبار الاولیا ۱۲ [2] حکایات الصالحین ۱۲ [3] سیرت المحمود، حکایات الصالحین و اخبار الاولیا ۱۲

محمود کا ہاتھ پکڑ کر بولا: "او مردود نابکار! بتا تیرے پاس وہ کون سی چیز ہے جس پر تو اتنا مغرور ہو گیا ہے؟ کیا یہ جھوٹی عزت؟ یہ مصنوعی شہرت؟ یہ فانی دولت؟ یہ علم جس پر جہل بھی ہنستا ہے؟ مگر او کم ظرف! یہ ایسی کون سی چیزیں ہیں جن پر تو گھمنڈ کرتا ہے؟ ہاں تو بدگہر تھا، تیری فطرت ذلیل تھی، تیرے ظرف میں علم و دولت کے لئے سمائی نہ تھی، تو ذرا سی پونجی لیکر اچھل پڑا، لیکن او مغرور! یہ تیری دیوانگی ہے، اسوقت سے ڈر جب خدا کی فطرت تجھے پکڑے گی، اور تیرے پاس اس فرعونیت کا کوئی جواب نہ ہوگا۔ تو اُجلی اُجلی، خوش وضع، قیمتی پوشاکیں پہنکر اکڑتا ہے، لیکن کہیں تو نے کبھی اپنے باطن کو بھی دیکھا کہ وہ کتنا غلیظ اور سیاہ ہے، آج تو زمین پر اتراتا ہے، مگر یاد رکھ کہ کل تجھے آسمانوں میں ذلیل ہونا پڑے گا۔"[1]

آپ نے اسوقت تو یہ باتیں جبراً و قہراً سن لیں، اور اُن سے پیچھا چھٹا کر خوب مذاق اُڑایا، لیکن یہ تیر خالی جانے والے نہ تھے، آہستہ آہستہ دل میں اُتر گئے۔ یہ جاڑے کی چوٹ تھی جو اسوقت تو کچھ نہ معلوم ہوئی مگر ہڈی ہڈی میں بیٹھ گئی۔ فطرت صالحہ کو ایک اشارہ کافی تھا، وہ مہمیز پاتے ہی اپنی راہ لگ گئی۔ اب شب و روز یہی فکر تھی کہ کسی طرح ان کاروبار سے چھٹکارا پائیں اور کسی گوشہ میں بیٹھکر یاد دلدار سے جی بہلائیں۔ مگر وہ دلدار کہاں تھا؟ دل میں ہر وقت اسی نامعلوم کو ڈھونڈھنے کا جذبہ بیقرار رکھتا تھا۔ عزیز و اقارب اس جذب وحشت سے بہت متفکر تھے، انھوں نے تفریح کے لاکھوں سامان پیدا کئے، دوستوں نے ہر طرح جی بہلانے کی کوشش کی، لیکن یہ درد ایسا نہ تھا جو کسی رنج سے جلا جائے۔ عشق کی آگ میں جل جل کر تڑپنا مقسوم تھا، تڑپتے رہے، گریبان کا چاک دامن کے چاک سے آملا، گھر کو چھوڑ دیا، مال و دولت پر لات ماردی، اور دشت و صحرا میں آبلہ پا سر ٹکراتے پھرے۔ لیکن اس سے کیا ہو سکتا تھا، دل کی وحشت زدگی کے لئے شہر و ویرانہ دونوں ایک ہیں، دل کی ویرانیاں جنگل کی سنسانیوں سے آباد نہیں ہوسکتیں۔

اسی وحشت کے عالم میں پھرتے پھراتے روہیل کھنڈ کی طرف نکل آے، یہاں ایک دوست مل گئے، وہ آپ کو ایک زمانہ میں بڑی شان و شوکت سے دیکھ چکے تھے، اب اس حال میں دیکھا تو رو پڑے۔ پوچھا "نصیر الدین! خیر تو ہے؟ یہ تم کس حال میں ہو؟ بولے ہاں اچھا ہوں، جس حال میں ہوں خوش ہوں، دعا کرو کہ خدا میرے مقصد میں مجھے کامیاب کرے۔" انھوں نے کہا: میرے ساتھ دہلی چلو، وہاں شاید کوئی صورت نکلے، آپ نے کہا، مجھے یہیں رہنے دو، وہاں جاکر کیا کروں گا، میرا جی انھیں بیابانوں میں بہلتا ہے[2]

لیکن وہ مجبور کرکے اپنے ساتھ دہلی لائے، یہاں جس نے دیکھا افسوس کیا، اور اپنے اپنے خیال کے موافق ہمدردی کی کہ ان کا منشا نظر صرف ظاہری کامیابی نہیں، مگر اہل نظر میں جس نے دیکھا خوش ہوا۔ قاضی محی الدین کاشانی مل کر بولے۔ نصیر الدین یہ کیفیت مبارک ہو۔ اور اپنا مہمان بناکر تربیت دی[3]

حسن اتفاق سے قاضی اسی زمانہ میں بیمار ہوگئے اور یکایک مرض اتنا بڑھ گیا کہ زیست کی امید نہ رہی۔ حضرت محبوب الٰہی عیادت کو تشریف لائے۔ قاضی اسوقت بیہوش تھے، شیخ نے اپنا ہاتھ ان کے منھ پر پھیرا، وہ ہوش میں آگئے، اور طبیعت ایسی بحال ہوگئی کہ جیسے بیمار ہی نہ ہوے تھے۔

---

[1] سیرت المحمود، اخبار الاولیا، روضۃ الاخیار ۱۲ [2] حکایات الصالحین ۱۲ [3] سیرت المحمود ۱۲

...دیکھکر ششدر رہ گئے، اور یہ سمجھ کر کہ میرے درد کی دوا یہی کریگا، اک عجب انداز سے اٹھے اور روتے ہوئے شیخ کے قدموں پر گر پڑے۔ انھوں نے شفقت سے آپ کا سر اُٹھا کر سینہ سے لگا لیا، اور دیر تک سینہ سے لگائے تسکین دیتے رہے۔ کہتے ہیں شیخ کا ہاتھ لگتے ہی اک ٹھنڈک ...رے سارے جسم میں دوڑ گئی، سارا رنج و غم سکون و مسرت سے، اور تمام درد و تپش کشف و مشاہدہ سے بدل گئی، اور میں ایسا محسوس کرنے ...یں دنیاوی زندگی ختم کر کے نئے جنم میں آگیا ہوں۔ چلتے وقت میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے مجھے اپنے ہاں لے گئے اور میری مشکل آسان ...ا۔

...بیعت ہونے کے بعد رات دن سلسلہ کے اشغال و اذکار کے سوا کسی سے سروکار نہ تھا۔ بیشتر اوقات تنگ و تاریک گوشوں میں بیٹھکر اپنا ...تے۔ رات کا سونا بالکل چھوڑ دیا تھا، ابتدائے سلوک میں معمولی روزے رکھتے تھے، لیکن بعد کو ایک ایک ہفتہ کا روزہ رکھنے لگے، ع۲ ...جوش و پر خلوص محنت و ریاضت سے آپ ساری بزم میں ضرب المثل ہوگئے۔ اور ان لوگوں سے بھی آگے بڑھ گئے جو آپ سے پہلے ...ہ میں قدم رکھ چکے تھے۔ حضرت محبوب الٰہی ان باتوں کی وجہ سے آپ پر بہت عنایت فرماتے، اور ہمیشہ اپنے پہلو میں جگہ دیتے تھے۔ عام مرید ...رت مند شیخ کے مزاج میں آپ کا یہ درخور دیکھ کر بہت قدر و منزلت کرنے لگے، اور آپ کا حجرہ بھی ایک چھوٹا سا دربار بن گیا ع۳ لیکن اب ...نگ دوسرا تھا، ان باتوں سے دل سیر ہو چکا تھا، ہنگامہ آرا بزم افروزیاں اسی وقت تک اچھی معلوم ہوتی تھیں جب تک حقیقت سے دور ...آپ جو حقیقت کا رخ زیبا دیکھ لیا تو سب سے بیزار ہوگئے، اور مدام اسی میں مشغول و مستغرق رہنے لگے، تھوڑی دیر کی مشغولیت دنیا ...زاں گزرتی تھی۔ لوگوں کے ہجوم و ہنگامہ میں دن بدن زیادتی دیکھکر حضرت امیر خسرو کے ذریعہ شیخ سے کہلوایا کہ یہاں رہنے سے مشغولی میں فرق آتا ...م ہو تو کسی اور سنسان مقام پر چلا جاؤں اور فراغ خاطر سے عبادت کروں" حسب معمول حضرت امیر خسرو نے آپ کا پیغام عرض کر دیا ...کہا۔ نصیر الدین سے کہو کہ تمھیں اسی مزاحمت میں رہکر اپنا کام کرنا چاہیے، وہ سلوک ناقص ہے جو جنگلوں میں تکمیل پاتا ہے چنانچہ آپ ...ہیں رہے اور "دل بہ یار و دست بکار" کے اصول پر کاربند ہوگئے ع۴

...بیعت کے پانچویں چھٹے برس حضرت محبوب الٰہی نے مدینہ منورہ جانے کا حکم دیا۔ آپ ایک خادم کو لیکر فیض آباد ہوتے ہوئے روانہ ہوگئے ...قریب دو سال مقیم رہے ع۵۔ خلوص، محبت اور سچی طلب کے یہ دو سال آپ کی سالکانہ زندگی کے لئے دو صدیوں سے بھی زیادہ تھے جن ...مات کی سیر کی، جو جو کیفیتیں طاری ہوئیں بیان سے باہر ہیں۔ ناسوت سے جبروت و لاہوت و ہاہوت کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو نہ دیکھ ...ور جسکی ہر منزل سے پوری طرح نہ گزر گئے ہوں۔ ایک مراقبہ کی کیفیت ہے: میں نے اپنے جسم کو دیکھا کہ نور ہو کر عرش کو محیط ہو گیا ہے، ...نور کے اثرات آسمان و زمین کے سارے عالموں میں پہونچ رہے ہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ میرا رواں رواں ایک صورت ہو گیا ہے، اور ہر ...بالکل میری سی ہے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ تمام زمینیں اور تمام آسمان، تمام انفس اور تمام آفاق اپنے اصلی رنگ میں میرے سامنے ...، اور کل افعال و اسماء، آثار و صفات پر میری دسترس ہو گئی ہے۔ اسی کے ساتھ میرے کانوں میں ایک ایسے نغمہ کی آوازیں آنی شروع

...یات الصالحین و سیرت ع۲ روضۃ الاخیار ع۳ اخبار الاولیا ع۴ سیر الاولیا و اخبار الاخیار ع۵ سیر السالکین ۱۰

ہوئیں کہ مجھ پر محو آمیز بیخودی طاری ہوگئی - اسی میں میں عین ذات کے بے نقاب نظارہ سے مشرف ہوا - اسی زمانہ میں حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے بھی کئی بار شرف اندوز ہوئے - تمام صحابہ اور انبیا سے ملاقاتیں کیں، اور یہ کیفیت اتنی بڑھ گئی کہ چشم باطن کے کشف و ذوق ہی سے نہیں بلکہ چشم ظاہر سے بھی ان کو دیکھتے اور اُن سے گفتگوئیں کرنے لگے - اور یہ واقعہ تو بہت مشہور ہے کہ آپ نے محی الدین ابن عربی، امام غزالی، جلال الدین رومی، عثمان ہارونی، مودود چشتی، ابو اسحاق شامی، شیخ جیلانی، امام بخاری اور عین القضاۃ ہمدانی سے ان کے خاص خاص مسائل کے متعلق بالمشافہ گفتگوئیں کی ہیں - فرماتے تھے : یہ بات مجھے مدینہ طیبہ جانے اور وہاں رہنے ہی سے حاصل ہوئی - میں پہلے محض زیارت کیلئے مدینہ جانے کا قائل نہ تھا، لیکن اب معلوم ہوا کہ قرب زمان کی طرح قرب مکان بھی بے اندازہ رحمت و برکت کا باعث ہوتا ہے اور اپنے پچھلے اعتقاد پر توبہ کرتا ہوں[۱] -

یہاں کے قیام میں وہ شہرت حاصل ہوئی کہ اس صدی میں شائد ہی کسی کو حاصل ہوئی ہو - اخبار الاولیا میں لکھا ہے کہ: ایک جہان نے شرف وابستگی حاصل کیا، اور دنیائے اسلام سے دیار نبی میں آنے والے علماء و مشائخ نے اعتراف کیا کہ: "ایں آفتابے ست کہ مثل ما ہزاراں ستارہ ہا در سایۂ او گم اند" سیرت المحمود میں لکھا ہے :-

علماء از دور و نزدیک بخدمت رسیدند، و امراء از ترک و تاجیک بشرف حضور بہرہ ور گردیدند، مشائخ عہد ارادت آوردند، اکابر زمانہ بتواضع برخاستند"

تذکرۃ الفضلا میں ایک قادری بزرگ کے الفاظ مرقوم ہیں کہ :-

ذات بابرکات ایشاں آیتے بود از آیات الٰہی، و نعمتے بود از نعمائے ربانی"

اور یہی نہیں کہ صرف انھوں ہی نے اعتراف کیا ہو، صرف دوستوں نے ہی نے تربیت کی ہوں، صرف متعلقین و متاثرین ہی نے نیازمندی کا اظہار کیا ہو - بلکہ آپ کے حسن کا اصلی کمال یہ تھا کہ دشمنوں نے بھی کمال علم و طریقت کا اعتراف کیا[۲]، بزرگوں اور استادوں نے بھی گردنیں جھکائیں اور قاضی محی الدین کاشانی نے جو آپ کے استاد بھی تھے اور راہ سلوک کے اولین رہنما بھی، ایک جماعت کے سوال پر کہا: بدولت ایشاں سہا طلا شد و ذرہ ہا آفتاب"[۳] (باقی)

[۱] سیرت المحمود اخبار الاولیا و مکایات الصالحین [۲] حکایات الصالحین [۳] سیرت المحمود

اگر ۲۹ء میں

آپ نگار کی خریداری کی ابتدا کرتے ہیں، تو شروع سال یعنے جنوری سنہ ۲۹ء کے پرچہ سے ابتدا کیجئے۔ کیونکہ جنوری سنہ ۲۹ء کا پرچہ ۱۶۰ صفحہ پر نکلا ہے اور بہترین مضامین نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔

"منیجر نگار لکھنؤ"

تاریخ عرب کی ایک روایت جمیل

پہلی صدی ہجری کا ایک واقعۂ حسن و عشق

اور معاویہ و حسین کے کردار کا فرق

وہ روایت جو اس مختصر مضمون کی بنیاد ہے، کوئی فرضی واقعہ نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے مسعودی صاحب اغانی ابن قتیبہ، حموی، اور ابن بدرون وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

اس واقعہ سے غوامض تاریخ عرب کا اگر ایک یہ باب سامنے آتا ہے کہ خلفاء راشدین کے بعد امویین کی حکومت کیا اسلوب اختیار کر رہی تھی اور انکی حیات اجتماعی میں کن اخلاق کا نشو و نما ہو رہا تھا، تو دوسری طرف معاویہ کے بالکل برعکس حسین کی سیرت کا وہ نمونہ بھی سامنے آتا ہے، جو بعد کو "ذبح عظیم" کی صورت میں حکومت بنی اُمیہ پر ایک ایسی بے لاگ تنقید کر گیا جس کی نظیر دنیائے حق و صداقت میں مشکل سے دوسری مل سکتی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس زمانہ میں اہل عرب کی "روح ادب" کس ذوق سے وابستہ تھی اور انکے ہاں ایک "عورت" کی تکمیل نسائیت کا صحیح معیار کیا تھا۔

نیاز

افراد:-

حسین	=	ابن علی مرتضےٰ
معاویہ	=	ابن ابی سفیان (امیر وقت)
یزید	=	معاویہ کا بیٹا اور ولی عہد
رقیق	=	معاویہ کا معتمد علیہ نوجوان غلام
عبداللہ بن سلام	=	والیٔ عراق
ارینب	=	عبداللہ بن سلام کی بیوی اور اپنے عہد کی بے مثل جمیل عورت
ابوہریرہ	=	صحابی رسولؐ

ابوالدرداء — صحابی رسول

معاویہ کی ایک جوان لڑکی

(رات کا وقت ۔ یزید اپنے کمرہ میں مسند زرکار پر مغموم سا بیٹھا ہوا ہے، عود و عنبر کا دھواں فضا کو معطر کئے ہوئے ہے، سامنے اسباب بادہ خواری مہیا ہے، اور رقیق (معاویہ کا غلام) سامنے خاموش حکم کا منتظر ہے)

یزید (جام شراب ہاتھ میں لیکر) "اے رقیق، میں نے تجھے اس لئے یاد کیا کہ آج ترک نشاط کا عہد کرنے والا ہوں اور شاید تجھ سے بہتر شاہد اس کا اور کوئی نہ ہو سکتا (جام رقیق کی طرف بڑھا کر) لے، اس کو باہر جا کر کہیں دور پھینک آ اور یہ سارا سامان چور چور کر ڈال ۔ رقیق، جلدی کر، یہ خون کے گھونٹ کب تک پیونگا، اور دل کی آگ کو کہاں تک اس طرح اور بھڑکاتا رہوں گا"

رقیق (دوزانو ہو کر یزید کے ہاتھ سے جام لیتے ہوئے) "اے خاندان امیہ کے چشم و چراغ، تعمیل حکم مجھ پر فرض ہے، لیکن اگر کبھی کبھی غلام کی گستاخیاں معاف کی جا سکتی ہیں، تو مجھے پوچھنے دیجئے کہ اس وقت سرزمین عرب کی وہ کونسی دولت و لذت ہے جو آپ کے قدموں تک پہونچنے کی آرزو مند نہیں اور وہ کیا آزار ہو سکتا ہے جو عرب کے ایسے حسین و جمیل شاہزادہ کو اسدرجہ ملول بنا دے؟

یزید ۔ (منہ پھیر کر) "رقیق، جا، اصرار نہ کر، دل کا چھالا پھوٹتا ہے، تو زہراب بہتا ہے، بہتر یہی ہے کہ میرا آزار، راز ہی رہے، ورنہ ممکن ہے کہ اسکا اظہار خود میرے لئے اور زیادہ باعث زحمت ہو جائے"

رقیق ۔ (کمر سے پیش قبض نکالکر یزید کے سامنے رکھتے ہوئے سر جھکا کر) لاعلمی کی حالت میں اصرار کئے جانا اور ہلاک ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ زندہ رہوں اور اس علم کے ساتھ کہ آپ نے مجھے رازداری کا اہل نہ سمجھا ۔ اگر آپ کو اخفاء پر اصرار ہے تو مجھے اس بے اعتباری کی زندگی بسر کرنے سے انکار ۔ رقیق اب اپنا سر لے کر یہاں سے واپس نہیں جا سکتا ۔ اس لئے میں ادھر جام پھینکتا ہوں اور ادھر آپ اس پیش قبض کو میری گردن پر پھیر دیجئے

یزید ۔ (پیش قبض کو لیکر دور فرش پر پھینکتے ہوئے) رقیق کیوں مجھے مجبور کرتا ہے کہ اپنے غم میں تجھے بھی شریک کروں جبکہ اسکا مداوا دنیا میں کوئی نہیں امیر المومنین (امیر معاویہ) کی پدرانہ شفقت، امیرانہ رحمت کونسی ایسی ہے جو مجھے حاصل نہیں، لیکن یہ میری بدقسمتی کی انتہا ہے کہ باوجود ان تمام الطاف خسروانہ کے میری بے نوائی کا وہی عالم ہے اور میری مجبوریاں علیٰ حالہا قایم ۔

اگر زندگی کی حقیقی راحت و مسرت، اگر حیات کی سچی لذت و حلاوت کا تعلق کبھی قلب و روح سے بھی ہو سکتا ہے تو مجھ سے زیادہ ماتم گسار اور کون ہو سکتا ہے کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ میرا جسم ملبوس زرکار سے آراستہ نظر آتا ہے، میری روح ایک گدا کی طرح محتاج ہے اور جس وقت دنیا حشم و خدم کے ساتھ مجھے دیکھتی ہے، میرا قلب ایک ویرانہ کی طرح سنسان ہوتا ہے ۔

میری یہ امیرانہ زندگی، یہ شاہانہ سطوت، یہ ملوکانہ اقتدار، یہ خسروانہ جاہ و جلال، حقیقتاً یہ سب ایسے پردہ کے نقش و نگار ہیں جس کے اٹھ جانے کے بعد سوائے سوگ اور ماتم کے کچھ نظر نہیں آسکتا ۔

جسم سے نہیں میرے قلب سے پوچھ کہ اس نرم مسند سے زیادہ سنگ خارا کوئی اور ہو سکتا ہے، کام و دہن نہیں روح سے دریافت کر کہ ان نعایم و لذایذ سے زیادہ گرسنگی کوئی اور ہو سکتی ہے ۔ دنیا جس وقت مجھے نشۂ شراب میں بدمست دیکھتی ہے، اس وقت مجھ پر خود اپنا ہی

خون پینے کا جنون ہوتا ہے، اور زمانہ جب مجکو محو نغمہ و موسیقی دیکھتا ہے، تو اسوقت میری ہستی یکسر فریاد و آہ ہوتی ہے، لیکن کس سے کہوں کہ کوئی رازداں نہیں، اور کیوں کہوں جب میرے درد کا کوئی درماں نہیں "

رقیق "سچ ہے، مجھ میں نہ رازداں بننے کی اہلیت اور نہ تلاش درماں کا سلیقہ، لیکن یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ آپ کے ساتھ اپنا دل دکھانے اور آپ کے قدموں پر اپنی جان دیدینے کی تمیز مجھ میں ضرور ہے، اس لئے مجھے اسکا موقعہ دیجئے، اسکی اجازت دیجئے، حیران ہوں کہ معاویہ کا بیٹا، سفیان کا پوتا جس کا مردانہ عزم سنگین سے سنگین قلعہ فتح کر سکتا ہے، وہ ایک عورت کے نرم و نازک دل کی طرف سے اس درجہ خائف ہو، ذرا میں بھی تو سنوں کہ حرم کی کنیزوں، امرا کی بیٹیوں میں وہ کون ایسی بدنصیب ہے جو آپ کی پُرجوش محبت کی قدر کرنا نہیں جانتی۔ حسن و شباب نہایت بیش بہا دولت ہے، لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس سے زیادہ ارزاں سودا بھی کسی اور چیز کا نہیں ہوتا۔ کچھ کہئے تو سہی کیا یہ عتاب حبابہ و عذرا، رباب و سلمہ پر ہے، یا کوئی اور سرزمین نجد کی لڑکی ہے جسنے آپ کو اسقدر دیوانہ محبت بنا رکھا ہے "

یزید - (ایک آہ سرد کے ساتھ) " نہ وہ میری کنیزان حرم میں سے حبابہ و عذرا ہے نہ نجد کی کوئی لیلیٰ، بلکہ وہ عراق کی تاکستان کی شراب ہے، وہاں کے باغ کی بہار ہے، وہ ارنیب ہے اور خوش نصیب عبداللہ بن سلام، والی عراق کی بیوی، جس کے حصول کے لئے میں صرف وہ ایک لمحہ چھوڑ کر جس میں اس کے لب میرے لب سے متصل ہوں، اپنی ساری زندگی دیدینے کے لئے آمادہ ہوں۔ اے رقیق تو نے اسے نہیں دیکھا اس لئے شاید مجھ پر ہنسے لیکن باور کر کہ صحرا عرب آج تک کوئی ایسا غزال رعنا پیدا نہیں کر سکا، اور نہ سرزمین شام نے ایسی سیہ چشم نازنین آج تک کبھی دیکھی، اسکی رعنائی ایک ایسا تیر ہے جو ایک بار دل میں پیوست ہو جانے کے بعد نکالا نہیں جا سکتا، اس کی چشم شہلا کی ہر نگاہ غلط انداز ایک ایسا کرشمہ ہے جس میں بیک وقت سحر بھی ہے اور شراب بھی جو مسحور بھی کر دیتا ہے اور مخمور بھی۔ اس کی لانبی سیاہ پلکیں جنکی ہر جنبش بہ حالت التفات رگ جاں ہے اور بہ صورت عتاب نوک سناں، ...... اس حریر سے بنائی گئی ہیں جسے نازنینان روما کی نرم و لچیلی انگلیاں طیار کرتی ہیں۔ وہ اس کے نازک لب جن کے دیکھنے کے بعد ہی گلاب کی ملفوف پنکھڑی کا مفہوم ذہن میں آسکتا ہے، ایک ایسا سرچشمہ حیات ہیں، جس سے سیراب ہونے کے لئے جان کی قربانی حد درجہ ناقص تعبیر شوق ہے۔ وہ اس کا صبیح رنگ، جس سے آفتاب طلوع صباح کا استعارہ کرتا ہے، وہ اس کے سیاہ بال، جن سے برسات اپنی بھیگی ہوئی خنک رات طلب کرتی ہے، وہ خوبصورت دانت جس سے الماس اپنے سرمایہ ضیا کا آرزومند ہے، وہ رخسار جن سے شمع محفل کسب نور کرتی ہے، اور اسی طرح اس کے جسم کا ہر ہر حصہ، اس کی خوش ادائیوں کا ایک ایک کرشمہ، اس کی عشوہ فرمائیوں کا ایک ایک رمز، اک مستقل دنیائے لذت و نشاط ہے، جس کے اظہار کے لئے عالم نقش و شعر میں اس وقت تک کوئی نقاش و شاعر پیدا ہی نہیں ہوا۔ ...... میں بتاؤں کہ میں نے کب اور کس عالم میں اول اول اسے دیکھا تھا۔ آہ، کلیجہ شق ہو جاتا ہے... وہ ابھی دوشیزہ تھی، اس کی شراب حسن ناچشیدہ تھی اور کیف دستی رسیدہ، ایک رات، وہ ایک ظالم رات جب میں نے اسے دیکھا، تو اپنے تمام ملکوتی جمال کے ساتھ، وہ زینت و آرائش کا بھی مجسمہ تھی اور ایک تقریب میں اپنی بہت سی ہمسن لڑکیوں کے ساتھ مصروف نشاط تھی، میں نے پوشیدہ طور پر ساری رات اسکو محو لہو و لعب دیکھا اور نہیں کہہ سکتا کہ کھیلتے ہی کھیلتے اس نے کتنی بار اور کس کس طرح، میری روح، اور میری حیات کا سودا کر لیا اس عمر میں خدا معلوم کتنی حسین لڑکیاں میری نگاہ سے گذر چکی ہیں جنکے حسن و جمال جن کے شاعرانہ ذوق اور نغمہ و موسیقی نے مجھے مانوف کیا اور میں ان کی قدر کرنے پر

مجبور ہوگیا، لیکن میرا ذرّوں کے سامنے جھک جانا اس وقت تک تھا جب تک زینب کے آفتاب حسن نے میرے سامنے طلوع نہ کیا تھا۔ لیکن جس وقت اس نے طلوع کیا تو میں اس کے سامنے جھک گیا، اس کو پوجنے لگا اور عہد کرلیا کہ ساری عمر اس کی پرستش میں صرف کردوں گا۔

اس رات اس نے جن کمالات نسائی کو پیش کیا ان کا اظہار بالکل محال ہے، وہ اس کا بلند ذوق شعری، وہ برجستہ و برمحل فصیح و بلیغ فقروں کا استعمال، وہ اس کا جاں نواز لحن، وہ اس کا رعشہ براندام کرنے والا رقص، الغرض اس کی وہ تمام دلربائیاں، جنہیں مشکل سے ایک تصور انسانی ایک جگہ فراہم کرسکتا ہے، حقیقی صورت میں میرے سامنے تھیں اور میں زندہ تھا!

رفیق، تو یقین کرکہ اس واقعہ کے بعد ایک ہفتہ تک مجھ پر مدہوشی کی سی کیفیت طاری رہی اور اس کے بعد جب میں نے دریافت حال کیا تو معلوم ہوا کہ اس درمیان میں عبداللہ بن سلام سے اس کا عقد ہوچکا ہے۔ تو اندازہ کرسکتا ہے کہ یہ خبر سنکر مجھ پر کیا گذری ہوگی اور اب میں کیونکر دنیا میں مسرور زندگی بسر کرسکتا ہوں۔ اے رفیق اگر تیری کوئی تدبیر اس باب میں کامیاب ہوگئی تو میرے اور تیرے درمیان خدا ہے کہ مجھ سے زاید انعامات کی بارش کرنے والا تجھے کوئی نہ ملیگا۔

رفیق "آپ پر میری جان فدا ہو۔ کیا مجھے اس سے زیادہ کسی انعام کی خواہش ہوسکتی ہے کہ آپ نے مجھے اپنا راز دار بنایا اور کیا میں حصول تمنا کے لئے کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا رکھونگا"

(یزید سر پکڑ کر رہجاتا ہے اور رفیق پردہ کھول کر باہر نکل جاتا ہے)

(۲)

(صبح کا وقت معاویہ کی خلوت گاہ، معاویہ ٹہل رہے ہیں اور رفیق سے باتیں کر رہا ہے)

معاویہ - "یقیناً میں نے یزید کو اپنا جانشین نامزد کرنے میں غلطی کی، اور جو دن گزرتا ہے مجھے اپنی اس غلطی کا احساس زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ غضب خدا کا، شب و روز مے خواری، رات دن فسق و فجور اور ہر لمحہ ایک نئی معصیت کی جستجو، میں نہیں سمجھتا کہ اگر یہ میرے بعد خلیفہ ہو بھی گیا تو کون اس کی عزت کرے گا اور عباس و علی کا خاندان کب اسکو حکومت کی مہلت دیگا"

رفیق - "امیر المومنین کا ارشاد بجا و درست ہے، لیکن غلام کا خیال یہی ہے کہ یزید کی موجودہ زندگی کی ذمہ داری بڑی حد تک ان لوگوں پر بھی ہے جو اپنے آپ کو اسکا بزرگ سمجھتے ہیں"

معاویہ "(غصہ کی حالت میں کھڑے ہوکر) رفیق یہ تو نے کیا کہا، کیا تیرا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس کو معصیت میں مبتلا کیا، میں نے اس کو شراب کا عادی بنادیا، میں نے اس کے بیوقوف دماغ میں گناہ کا خیال پیدا کیا؟"

رفیق (ہاتھ جوڑ کر) نہیں، اے امیر المومنین، نہیں۔ یہ کون کہہ سکتا ہے، اس خلاف حقیقت بات کو کون مان سکتا ہے، لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات انسان حالات سے مجبور ہونے کے بعد بھی بعض گناہوں میں مبتلا ہوجاتا ہے یہانتک کہ اگر وہ اسباب نہ پیدا ہوتے تو شاید وہ گمراہ نہ ہوتا۔ اور مجھے یقین ہے کہ یزید کی مے خواری اس کی فطرت نہیں بلکہ مجبوری ہے۔

معاویہ - "مجبوری! مجبوری کیا ہوسکتی ہے۔ میں کبھی اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں۔"

رقیق - "امیر المومنین، جب انسان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے تو وہ اپنی جانبری کی ہر ممکن تدبیر کرتا ہے۔ اگر یزید ارنیب کی طرف سے مایوس ہوکر ان مشاغل تفریح سے اپنے نفس کو دھوکا نہ دیتا تو وہ غریب کب کا ہلاک ہوگیا ہوتا۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اگر آج ارنیب حاصل ہوجائے تو کل یزید سے زیادہ متقی کوئی ہو نہیں سکتا۔"

(معاویہ خاموش اسر پکڑ کر رہجاتے ہیں اور دیر تک یہی عالم رہتا ہے۔ رقیق باہر جانا چاہتا ہے، معاویہ اس کو روک لیتے ہیں)۔

معاویہ - "رقیق، تجھ کو یقین ہے کہ یزید کی زندگی میں انقلاب ہوجائے گا اگر ارنیب ملگئی؟"

رقیق - "اے امیر المومنین، ایسا ہی یقین ہے، جیسے اس وقت طلوع آفتاب کا۔"

معاویہ - "اچھا، کاتب کو بلالا۔"

(کاتب آتا ہے)

معاویہ - "عبد اللہ بن سلام والی عراق کے نام میری طرف سے ایک خط لکھو کہ جسقدر جلد آسکتے ہو میرے پاس آجاؤ، کیونکہ ایک مہتمم بالشان امر تمہاری ہی فلاح و بہبود کا سامنے ہے۔"

(۳)

(عبد اللہ بن سلام، معاویہ کا مہمان ہے اور نہایت عزت و اکرام کے ساتھ ایک جگہ ٹھہرا دیا گیا ہے۔ معاویہ، ابوہریرہ اور ابوالدرداء کے ساتھ اپنے مکان میں بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے ہیں)

معاویہ - "(ابوہریرہ اور ابوالدرداء سے) آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ میری بیٹی جوان ہوگئی ہے اور میں اس کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے عبد اللہ بن سلام کو پسند کیا ہے۔ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟"

دونوں - "انتخاب اچھا ہے اور آپ کی رائے بہت مناسب معلوم ہوتی ہے۔"

معاویہ - "تو پھر آپ جاکر عبد اللہ بن سلام کو میری طرف سے یہ پیغام دیجئے، یقین تو ہے کہ وہ منظور کرلے گا۔"

(وہ دونوں جاتے ہیں۔ امیر معاویہ، کنیز کے ذریعہ سے اپنی لڑکی کو طلب کرتے ہیں۔ لڑکی اندر داخل ہوتی ہے۔)

معاویہ - "جس وقت ابوہریرہ اور ابوالدرداء تیرے پاس آکر عبد اللہ بن سلام کے ساتھ شادی کرنے کا پیغام تجھ کو دیں تو اس پیغام کو مسرت سے سننا اور جواب دینا کہ مجھے کوئی عذر نہیں، سوائے اس کے کہ فی الحال ارنیب اس کے پاس موجود ہے اور ایسی صورت میں میری غیرت شادی کی اجازت نہیں دیتی، اگر وہ اس کو طلاق دیدے تو بیشک میں راضی ہوں۔"

(۴)

(عبد اللہ بن سلام اپنے خیمہ میں منتظر بیٹھا ہوا ہے اور ابوالدرداء اور ابوہریرہ پردہ کھولکر اندر داخل ہوتے ہیں۔)

ابوہریرہ - "معاویہ بہت مسرور ہے کہ تم نے اس تعلق کو خوشی کے ساتھ قبول کیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ معاویہ نہ صرف امیر وقت ہی، بلکہ صحابی رسول

اور کاتب رسول ہونے کا بھی فخر اُسے حاصل ہے۔ پھر یوں بھی شرافت وسیادت، نجابت وامارت ہمیشہ سے اس خاندان میں چلی آرہی ہے، اس لئے یقیناً تم کو خوش ہونا چاہیے کہ اس نے اپنے خاندان میں تم کو شامل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن اس کی لڑکی کو اس امر میں اعتراض ہے کہ ازنیب کے ہوتے ہوئے وہ تمہارے ساتھ مسرت کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ اس لئے اب صورت صرف یہ رہجاتی ہے کہ تم ارنیب کو طلاق دو، یا اس رشتہ سے ہاتھ دھو"

(عبد اللہ یہ سُن کر گھبرا جاتا ہے اور افسردگی اس کے چہرہ پر چھا جاتی ہے۔)

ابو الدرداء۔ "یقیناً تمکو ارنیب کا چھوڑ دینا بہت شاق ہوگا، کیونکہ علاوہ حسن وجمال تہذیب وشائستگی کے محبت دیرینہ کا خیال بھی اس کے منافی ہے، لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ معاویہ کے خاندان میں شامل ہونا تمہارے لئے باعث فلاح ہو سکتا ہے تو تمکو چار وناچار ارنیب کو طلاق دینا پڑے گی"

عبد اللہ۔ "یہ صحیح ہے کہ ارنیب ایسی بیوی کا ملجانا میرے لئے انتہائی خوش قسمتی ہے، لیکن ارنیب کے لئے یہ امر باعث فخر نہیں ہو سکتا کہ میں اس کا شوہر ہوں۔ اس لئے میرا اسکو چھوڑ دینا اس کے لئے باعث تکلیف نہیں ہو سکتا جو تکلیف ہو گی مجھی کو ہو گی اس لئے اب جبکہ میں اتنا سفر کر کے یہاں آیا ہوں، امیر معاویہ کی خود یہ خواہش ہے اور میں اسپر راضی بھی ہوں، تو اب میرا انکار کر دینا صرف جذبات محبت کی بنا پر غالباً سیاست کے خلاف ہے اس لئے میں اسوقت آپ دونوں کو شاہد بناکر ارنیب کو طلاق دیتا ہوں، آپ جائیے اور امیر معاویہ اور ان کی صاحبزادی کو اطلاع دیجئے کہ میں نے انکی یہ خواہش بھی پوری کر دی ہے"

(عبد اللہ بن سلام باقاعدہ طور پر ارنیب کو طلاق شرعی دیتا ہے۔ اور ابو الدرداء ابوہریرہ طلاق کے شاہد ہو کر باہر چلے جاتے ہیں۔)

(۵)

(عراق میں عبد اللہ بن سلام کا مکان۔ امام حسینؓ ارنیب کے مہمان فرش پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ارنیب اندر حجرہ میں بیٹھی ہوئی ہے ابو الدرداء داخل ہوتے ہیں)۔

ابو الدرداء۔ "اسلام علیکم"

حسین۔ "وعلیکم السلام اے صحابی رسول"

ابو الدرداء۔ (آنکھوں میں آنسو لاکر) اے حسین تمہیں دیکھکر میرے سامنے عہد نبوی آگیا، آہ! وہ بھی کیا مسعود ومتبرک زمانہ تھا کہ ہمارا جو قدم اُٹھتا تھا خدا کی راہ میں اُٹھتا تھا اور آج میں دیکھتا ہوں کہ میری ہر سانس نا راستی کی فضا میں نکلتی ہے۔ خیر، خدا کی مرضی یہی ہے۔ میں یہاں ارنیب کو معاویہ کی طرف سے یزید کا پیغام نکاح دینے آیا ہوں۔ لیکن اے جگر گوشۂ رسول آپ یہاں کیسے تشریف لائے؟"

حسین۔ "میں بھی اسی غرض سے آیا ہوں کہ ارنیب کو اپنا پیام دوں"

ابو الدرداء۔ "افسوس ہے مجھے وہ خدمت انجام دینا پڑی ہے جس کو میرا دل نہیں چاہتا، عبد اللہ بن سلام ارنیب کو طلاق دینے کے بعد معاویہ کی بیٹی کو بھی حاصل نہ کر سکا کیونکہ اس نے انکار کر دیا۔ غالباً آپ نے سنا ہوگا اور چونکہ عبد اللہ بن سلام کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ سب مکر وفریب تھا

صرف اس لئے کہ کسی طرح ارنیب کو طلاق دلواکر یزید سے اس کی شادی کرادی جائے اور ہر جگہ اس کا چرچا ہو گیا، اس لئے معاویہ نے برہم ہو کر اسے معزول بھی کر دیا اور اب وہ غریب کسی طرف کا نہ رہا۔"

حسین۔ "یہاں، یہ ساری خبریں پہونچ چکی ہیں اور چونکہ آپ بھی اس غرض کو لیکر آئے ہیں اس لئے اب مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ارنیب سے دریافت کر لیجئے وہ مجھ میں اور یزید میں کس کو پسند کرتی ہے۔"

(ابوالدرداء حجرہ کے پاس جاکر ارنیب کو مخاطب کرتے ہیں)۔

ابوالدرداء۔ "اے ارنیب، مجھ کو تیرے حال سے بہت ہمدردی ہے، لیکن اب جبکہ عبداللہ بن سلام تجھے طلاق دے چکا ہے اس لئے کوئی چارہ نہیں سوائے اس کے کہ تو کسی اور سے نکاح کرے۔ اسوقت دو شخص تیرے خواہشمند ہیں، ایک یزید معاویہ کا بیٹا، اور اسکا ولی عہد اور دوسرا حسین ابن علی۔ ان میں سے تو جس کو مناسب سمجھے اپنے لئے اختیار کرے۔"

ارنیب۔ (دیر تک سکوت کرنے کے بعد) "اے ابوالدرداء، اگر آپ اس وقت یہاں نہ ہوتے اور یہ مسئلہ میرے سامنے آتا تو میں اسوقت بھی آپ ہی پر اس کا انحصار کرتی، اس لئے میں آپ سے دریافت کرتی ہوں کہ مجھے ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے اور میرے لئے فلاح کس کے انتخاب میں ہے۔"

ابوالدرداء۔ "میرا اس باب میں کوئی مشورہ دینا مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم خود فیصلہ کرو۔"

ارنیب۔ "ابوالدرداء، میں تمہارے بھائی کی بیٹی بھی ہوں، اس لئے یوں بھی تمہیں مشورہ دینا چاہئے تعجب ہے کہ تم صحابی رسول ہو کر یوں امر حق کے ظاہر کرنے سے احتراز کرتے ہو۔"

ابوالدرداء۔ "اگر تجھے اصرار ہے تو میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ حسین ابن علی میرے نزدیک زیادہ قابل ترجیح ہیں، کیونکہ میں نے رسول اللہ کو حسین کے لب چومتے ہوئے دیکھا ہے۔"

ارنیب۔ "تو بہتر ہے میں حسین کو پسند کرتی ہوں۔"

(اسی جگہ اور اسی وقت حسین کا عقد ارنیب سے ہو جاتا ہے اور ابوالدرداء چلے جاتے ہیں)۔

(۶)

(کچھ زمانہ کے بعد امام حسین اپنے مکان میں بیٹھے ہیں اور عبداللہ بن سلام داخل ہوتا ہے۔ اس حال میں کہ اس کا چہرہ بہت مغموم ہے اور غربت و افلاس اس کے کپڑوں سے ظاہر ہے)۔

حسین۔ "عبداللہ بن سلام، آؤ، مبارک ہو تمہارا یہاں آنا، کہو، معاویہ کو تم نے کیسا پایا۔"

عبداللہ بن سلام۔ (آہ سرد بھر کر) "معاویہ وہ ہے جس نے دھوکا دیکر میری زندگی کی بہترین لذت و نعمت مجھ سے چھین لی، میری امارت و سرداری کو غربت و افلاس سے بدل دیا اور میرا یہ حال ہے کہ دنیا میں کوئی ہستی ایسی نظر نہیں آتی جو میرے حال پر رحم کرے اور اپنی محبت سے میرے مصائب کو قابل برداشت بنا دے۔"

حسینؑ ۔ "اے عبداللہ بن سلام، اللہ تجھ پر رحم کرے اور تیری تکلیفوں کو دور کرے ۔ اگر میرے لایق کوئی خدمت ہو تو بلا پس و پیش بتاؤ، مَیں اس کے انجام دینے کے لئے ہر وقت آمادہ ہوں"

عبداللہ بن سلام ۔ "ہاں، میں اسی لئے آیا ہوں کہ آپ کے ذریعہ سے ارنیب سے اپنی ایک امانت طلب کروں جو مَیں نے اسکو دی تھی، اور ہمیشہ کے لئے اس سے رخصت ہو لوں"

حسینؑ ۔ (اوٹ کے اندر ارنیب سے) "عبداللہ بن سلام اپنی امانت تم سے طلب کرنے آئے ہیں ۔ وہ کیا چیز ہے؟"

ارنیب ۔ "مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا چیز ہے ۔ کیونکہ وہ تھیلی میں سربمُہر ہے اور مَیں نے اسے کھولا نہیں"

حسینؑ ۔ "تو بہتر یہی ہے کہ جس شخص نے امانت رکھی ہے خود اس کو اپنے ہاتھ سے واپس کر دو"

(حسینؑ باہر چلے جاتے ہیں اور ارنیب پردہ سے باہر آکر عبداللہ بن سلام کے سامنے آجاتی ہے ۔ عبداللہ تحیرانہ اس کو دیکھنے لگتا ہے اور پھر دونوں رونے لگتے ہیں ۔ کچھ دیر بعد) ۔

عبداللہ بن سلام ۔ (آنسو پونچھتے ہوئے) "اے ارنیب، مجھے تیری جدائی کا اتنا ڈر نہیں ہے، جتنا اس امر کا کہ میں اپنے آپکو تیرے قابل نہ ثابت کر سکا ۔ میں نے جس طمع سے تجھے طلاق دی اس کی سزا اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ احساس کہ میں نے تجھ سے بیوفائی کی اور اس احساس کے ساتھ تمام عمر بے چین رہنا ۔ اے ارنیب مجھے شرم آتی ہے کہ مَیں تجھسے ہمکلام ہوں، اور غالباً میں کبھی نہ آتا اگر میری موجودہ ستم حالت امانت واپس لینے پر مجبور نہ کرتی، کیونکہ اس تھیلی میں ایک قیمتی موتی ہے اور مَیں چاہتا ہوں کہ اس کو فروخت کر کے کسی جگہ گوشۂ گمنامی میں اپنی زندگی بسر کروں"

ارنیب ۔ (دامن سے آنسو خشک کرتے ہوئے) "یہ آپ کی امانت حاضر ہے، اور اگر کوئی اور چیز ایسی ہے جو میں پیش کر سکتی ہوں تو اسے بھی بتا دیجئے آپ نے جس محبت و عزت کے ساتھ میرے حقوق ادا کئے ہیں، وہ مجھ سے بہت زیادہ قربانی طلب کر سکتے ہیں، چہ جائے کہ مال و زر جو نہایت حقیر چیز ہے"

عبداللہ بن سلام ۔ "میں نے تجھے دیا ہی کیا ہے جو طلب کروں، البتہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ تو نے میرے اس قصور کو معاف کر دیا ہے تو غالباً میں ایک حد تک سکون کے ساتھ زندگی بسر کر سکتا"

ارنیب ۔ "اللہ اور اس کا رسول شاہد ہے کہ میں آپ کی ہر غلطی کو سچے دل سے معاف کرتی ہوں اور آپ سے بھی یہی استدعا ہے کہ میری طرف سے اگر کوئی فروگذاشت ہوئی ہو جس کا مجھے علم نہیں ہے تو آپ بھی درگذر کیجئے"

(عبداللہ بن سلام کا دل یہ سنکر بھر آتا ہے اور اٹھکر روتا ہوا باہر جانا چاہتا ہے ۔ حسینؑ اندر داخل ہوتے ہیں) ۔

حسینؑ ۔ "اے عبداللہ، تم کو اپنی امانت واپس ملگئی"

عبداللہ ۔ "ہاں، ملگئی، اور اب میں جاتا ہوں، آپ کی اس عنایت کا شکریہ"

حسینؑ ۔ "لیکن ابھی ایک امانت اور ہے جو تم کو ملنا چاہئے"

عبداللہ۔ "وہ کیا، میں نے تو اور کوئی چیز ارنیب کے پاس امانت نہیں رکھوائی تھی۔"

حسین۔ "لیکن میرے پاس تو ہے"

عبداللہ۔ "وہ کیا، اے میرے سردار"

حسین۔ "وہ ارنیب بنت اسحاق ہے، جس سے میں نے صرف اس لئے شادی کی تھی کہ طلاق دیکر پھر تمہارے ساتھ شادی کر دوں ظاہر ہے کہ اُس شدید طلاق کے بعد جو تم نے دی تھی ارنیب تمہاری نہیں ہو سکتی تھی تاوقتیکہ کوئی دوسرا شخص اس سے عقد کر کے طلاق نہ دے، اور میں نے مناسب سمجھا کہ یہ خدمت میں ہی انجام دوں"

(حسین یہ کہہ کر باہر چلے جاتے ہیں اور عبداللہ بن سلام اور ارنیب دونوں ایک ایسی حالت کے ساتھ جسمیں مسرت کا غیر معمولی جذبہ انسان کو گنگ بنا دیتا ہے، ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں)۔

نیاز

جانبی اختر دلہن کی ڈائری

رنج ہی ملتا ہے ورنہ مطالعہ کی حسرت اور طبع دوم کا انتظار شاق ہو

یعنی

سہاگ کی ابتدائی آٹھ راتیں باتصویر

دولہا دلہن کے لئے سبق آموز دستور العمل

راز و نیاز کی باتیں، شرم و حیا کا مجسمہ، تہذیب و اخلاق کا دلکش نمونہ، قانون محبت کا بیش بہا خزانہ، نوجوانوں کا رہبر کامل، ازدواجی مسئلہ پر مبسوط بحث جسمیں عروس نو نے اپنی ابتدائی آٹھ راتوں کی سرگذشت اپنی سہیلی کے واسطے قلمبند کی ہے قیمت ایک روپیہ چار آنہ (عہ) مضامین کی فہرست ملاحظہ ہو:۔

دیباچہ
ایفائے وعدہ
جنت حسن میں محبت کی تحریری
پہلا دن اور پہلی شب
اچھوتے حسن پر محبت کی مہر
دوسرا دن اور دوسری شب
دولہا دلہن کی میٹھی میٹھی چھیڑ چھاڑ
تیسرا دن اور تیسری شب
حسن شباب سے بیدردیاں
چوتھا دن اور چوتھی شب
بہار عیش
پانچواں دن اور پانچویں شب
دل شکستہ عروس کی فریادیں
چھٹا دن اور چھٹی شب
قلب نازک سے بدسلوکی
ساتواں دن اور ساتویں شب
جذبات عیش کی پابندی کی شرح
آٹھواں دن اور آٹھویں شب

عمل تسخیر کی ہدایتوں پر عمل کرنے سے آپ دوسروں کو اپنا فریفتہ اور دیوانہ بنا سکتے ہیں اس کتاب میں جو ہدایتیں لکھی گئی ہیں وہ نہایت آسان اور سہل ہیں ہر شخص اس پر عمل کر سکتا ہے۔ اگر یہ دعویٰ غلط ثابت ہو تو کتابوں کی قیمت واپس۔ قیمت آٹھ آنہ (۸)

بیوی کے فرائض امور خانہ داری، سلیقہ شعاری اور معاشرتی

معلومات جسکے پڑھنے سے آپ اپنے گھر کو جنت کا نمونہ بنا سکتے ہیں قیمت ۸/

محبت کے خطوط۔ عاشق و معشوق کی خط و کتابت نہایت دلکش پیرایہ میں جن کے پڑھنے سے کم علم ہونے پر انشا پردازی آجاتی ہے۔ قیمت ۸/

بصیرت بک ڈپو جامع مسجد ۲۵ دہلی

عالم فطرت، ماورائے علم و ادراک

دماغ انسانی کی خارق عادات اعجوبہ نمائیاں
اخبار عن الغیب کے محیر العقول واقعات

انسان جسکی زندگی کے تمام تجربات بظاہر صرف اس کے حواس متعینہ پر منحصر ہوتے ہیں، اگر ایک طرف اپنی سادگی فطرت کے لحاظ سے ایک ایسی بے حس و بیچارہ مخلوق ہے، کہ اگر اس کی آنکھ کے سامنے ایک ہلکا سا کاغذ بھی رکھدیا جائے تو وہ آفتاب ایسی عظیم الشان چیز کو بھی نہیں دیکھ سکتا، تو دوسری طرف وہ ایک ایسا لاینحل معمہ ہے کہ اس وقت تک یہی نہیں معلوم ہوسکا کہ اسکی ترقی کی آخری حد کیا ہے، یہاں تک کہ اب گفتگو اس میں ہے کہ کہیں خدا ہی تو نہیں ہے۔

انسان جس چیز سے عبارت ہے وہ نہ اس کے ہاتھ پاؤں ہیں، نہ آنکھ کان اور نہ کوئی اور عضو جسمانی، بلکہ علم و حکمت والے کہتے ہیں کہ انسان نام اس حقیقت کا ہے جسے عقل سلیم کہتے ہیں اور جس کے مظاہر بدو کائنات سے لیکر اسوقت تک تمام عالم میں ہر جگہ منتشر نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک جماعت اور ہے جو علم و حکمت کی حامل تو نہیں ہے لیکن اس کے معلومات کا ذریعہ علم و حکمت سے زیادہ کوئی بلند چیز ہے، اس کا خیال ہے کہ انسان نام عقل سلیم کا بھی نہیں، فضل و کمال کا بھی نہیں، بلکہ صحیح معنے میں انسان وہ ہے جو انسان پیدا ہوا ہے اور بلا کسی سبب کے انسان ہے کیونکہ اگر انسان نام صرف اس ذہنی اکتساب، علمی ترقی، اور تربیت دماغ کا ہے جسمیں ہر شخص برابر کا شریک ہوسکتا ہے تو پھر اس کو کیا کہیں گے جس کو اس نوع کی سعی و کوشش کا کوئی موقعہ میسّر نہیں آیا، لیکن اس سے ظہور ہوتا ہے ایسی باتوں کا جس کو دنیا کا بڑے سے بڑا حکیم و فیلسوف بھی سمجھنے سے عاری ہے۔

عالم فطرت کے تمام غوامض و نوامیس میں سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز اگر کوئی ہوسکتی ہے تو وہ انسان ہے جس کے بالشت بھر دماغ کی حقیقت کا بھی اسوقت تک انکشاف نہیں ہوسکا۔ اور بعض صورتوں میں بڑے بڑے عقل والوں کو اپنی کم فہمی اور جہل کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

انبیاء اور رسل کی نسبت بعض علمائے ظاہر کا خیال ہے کہ ان میں کوئی فطری خصوصیت موجود نہیں ہوتی۔ ہر شخص کوشش سے نبی ہوسکتا ہے، لیکن جسوقت ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ سعی و کوشش سے صرف ہوڈینی ہی کے درجہ تک پہونچ جائیں، جو ٹھوس دیوار کے اندر سے گذر جاتا تھا، یا ہندوستان کے ایک جاہل سادھو کی طرح صرف چند گھنٹہ ہی زمین میں دفن ہوکر زندہ رہیں، تو انکے پاس اسکا کوئی جواب نہیں ہوتا، اور انکو سوائے سکوت کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح نہ میں فورڈ و واٹسن ہو سکتا ہوں اور نہ فورڈ و واٹسن، تان سین اور بیجو باورے بن سکتے ہیں، اسی طرح نہ کوئی فیلسوف ہر واقعہ کا سبب دریافت کر سکتا ہے اور نہ کوشش کر کے ان حدود سے متجاوز ہو سکتا ہے جن کے اندر اس کے دماغ کی ساخت ہوئی ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ شاعر، نقاش، مغنی، صناع اور نبی سب پیدا ہوتے ہیں اور بننے سے نہیں بن سکتے۔ روئے زمین پر ہمیشہ متعدد ایسی غیر معمولی ہستیاں پائی گئی ہیں اور ہمیشہ انکے صدق و کذب پر بحث کی گئی ہے۔ پھر چونکہ اس سلسلہ میں روح و بقاء روح کا سوال بھی پیش آجاتا ہے اس لئے مذہب اور مابعد الطبیعیات دونوں کے نزدیک اس بحث کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، اور انسان جو فطرتاً بہت جستجو پسند واقع ہوا ہے نہایت دلچسپی کے ساتھ نہ صرف ان مظاہر کا مطالعہ کرتا ہے بلکہ انکی علمی توجیہ بھی کرنا چاہتا ہے۔

اس وقت اس قسم کے مظاہر پیش کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو ذریعہ مسمریزم یا ہپناٹیزم (تنویم مقناطیسی) براہ راست خود یا کسی وسیط یا معمول (medium) کے ذریعہ سے مختلف قسم کے حالات بتاتے ہیں، روحوں کے طلب کرنے کے مدعی ہیں اور بعض اوقات روحوں کی تصاویر بھی دکھا دیتے ہیں، اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو بغیر واسطہ مسمریزم لوگوں کے دل کا حال معلوم کر لیتے ہیں، خط کے اندر کی عبارت پڑھ لیتے ہیں، زمین کے اندر دفن ہو کر گھنٹوں زندہ رہتے ہیں۔ موٹی موٹی زنجیر توڑ ڈالتے ہیں، موٹر کو روک لیتے ہیں جامد اجسام سے عبور کر جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

پہلے قسم کے لوگوں کا یہ دعوی کہ وہ روحوں کو طلب کر لیتے ہیں یا ان کی تصاویر دکھا دیتے ہیں، کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کے تسلیم کرنے میں بہت سے علمی محالات کو ماننا پڑے گا۔ روح اگر جسم سے جدا ہونے کے بعد باقی رہنے والی چیز ہے تو ظاہر ہے کہ اسکا وجود بغیر کسی وساطت کے نہیں پایا جا سکتا اور اگر اس کو وجود محض مانیں تو دوسرے الفاظ میں گویا اسکو خدا ماننا پڑے گا۔ پھر بلانے سے اسکا آجانا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس چلا جانا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ اس طرح حیز زمانی و مکانی دونوں کا وجود اس کے لئے ضروری ہوگا اور یہ بالکل خلاف عقل ہے۔ روحوں کی جو تصویریں دکھائی جاتی ہیں، وہ خود اس کا ثبوت ہیں کہ یہ سارا تماشہ محض شعبدہ ہے۔ کیونکہ یہ تصویریں بالکل انسانی جسم کی تصویریں ہوتی ہیں، وہی تمام اعضاء، وہی وضع و ملبوسات، وہی خط و خال۔ اول تو روح محض جو غیر مرئی چیز ہے فوٹو کے شیشہ پر نمایاں ہو ہی نہیں سکتی اور اگر اس سے قطع نظر کر لیں تو بھی اس کا جسم انسانی اور اس کی تمام خصوصیات اور دنیاوی وضع و لباس کے ساتھ رونما ہونا کوئی معنے نہیں رکھتا۔ امریکہ کے مشہور علمی پرچہ سائنٹفک امریکن نے زر کثیر صرف کر کے ایک جماعت اسکی تحقیق کیلئے متعین کی تھی، اور اس نے جو رپورٹ پیش کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف روحوں کی تصویریں بلکہ اکثر بیشتر میڈیم کے ذریعہ سے یا وسیط و معمول کی وساطت سے روحوں کا طلب کرنا بھی محض مکر و فریب ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں یہ ضرور ماننا پڑیگا کہ مسمریزم یا ہپناٹزم ضرور ایک ایسی دماغی قوت ہے جو دوسروں کو متاثر کر کے بعض غیر معمولی باتوں کو دائرہ علم میں لے آتی ہے، لیکن یہ صرف عامل کی قوت ارادی اور دماغی برتری کا نتیجہ ہے۔ اسکو کسی روح کی آمد و رفت سے کوئی علاقہ نہیں۔

دوسری جماعت سے جو خارق عادات واقعات ظہور میں آتے ہیں، ان میں بعض کا سبب مشق و تربیت ہے، مثلاً زنجیروں کا توڑنا، موٹر کا روک لینا وغیرہ کہ اعصاب انسانی میں فطرت کی طرف سے ایک غیر معمولی اہلیت ودیعت ہوئی ہے کہ اگر انکی پرورش کی جائے تو

اس نوع کے بہت سے مافوق الفطرت واقعات اس سے ظہور میں آسکتے ہیں۔ لیکن بعض باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اکتساب ومشق، تعلم وتربیت سے متعلق نہیں ہیں۔ بلکہ خود فطرت ذہن وعقل، روح ودماغ کو غیر معمولی پیدا کرتی ہے اور بند تحریروں کو پڑھ لینا، پوشیدہ سوالوں کا جواب دیدینا، مستقبل کے متعلق صحیح پیشین گوئیاں کردینا اکثر وبیشتر ایسے ہی دماغ والوں کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے۔

حال ہی میں یورپ کا ایک شخص ہوڈینی جو ساحر کے لقب سے مشہور ہوگیا تھا، انہیں لوگوں میں سے تھا اور اس سے ظاہر ہونیوالے واقعات کسی لاگ یا شعبدہ کا نتیجہ نہ ہوتے تھے بلکہ فطرتاً اسکی قوت ارادی اتنی بڑی زبردست تھی کہ جس بات کا وہ ارادہ کرتا تھا پوری ہوجاتی تھی، یوروپ میں مختلف مقامات پر بڑے بڑے جلسوں میں اسکا امتحان لیا گیا اور آخر کار ہر شخص کو اعتراف کرنا پڑا کہ جو کچھ اس سے ظاہر ہوتا ہے وہ باوجود غیر فطری ہونے کے بالکل فطری ہے۔ مثلاً ایک ادنیٰ سی بات یہ تھی کہ کوٹھری کے اندر بند کر دینے کے بعد وہ دیوار کے اندر سے نکل آتا تھا، بظاہر یہ کس قدر ناممکن سی بات ہے، لیکن ایسا ہوتا تھا اور لوگ دیکھتے تھے۔ یا یہ کہ اسکو کتنی ہی موٹی زنجیروں سے باندھ دیجئے، لیکن بغیر زنجیر توڑے ہوئے وہ اپنے آپ کو آزاد کر لیتا تھا۔ بہر حال اسکی زندگی کے بہت سے واقعات ہیں جن سے یوروپ کا ہر شخص واقف ہے۔

اس سے قبل ایک نہایت مشہور شخص جو لوگوں کے دل کا بات معلوم کر لیتا تھا اور جس سے کسی راز کا چھپنا دشوار نہ تھا، کمبرلینڈ تھا، جس کو اپنی اس قوت کا حال اتفاق سے معلوم ہوگیا۔ ایک مرتبہ وہ اپنے دوست کے مکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ مسمریزم پر گفتگو شروع ہوئی، کمبرلینڈ نے کہا کہ دوسروں کے دل کی بات معلوم کر لینا دشوار نہیں ہے، اور یہ کہکر اس نے غور کیا تو اپنے دوست کے دل کی بعض باتیں اسپر منکشف ہونے لگیں، اتفاق سے اس وقت اس کے دوست نے کمبرلینڈ سے دریافت کیا کہ اگر یہ ممکن ہے تو بتاؤ میرے دل میں کیا ہے اور جس وقت کمبرلینڈ نے بتا دیا تو اس کو سخت حیرت ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد کمبرلینڈ نے جو غور کرنا شروع کیا تو اسے اپنی اس قوت کا حال زیادہ وضاحت کیساتھ معلوم ہونے لگا۔

کمبرلینڈ نے اس کے بعد کے جو تجربات اپنے قلمبند کئے ہیں وہ نہایت عجیب وغریب و پر لطف ہیں۔ وہ لکھتا ہے پہلے مجھے یہ یقین نہ تھا کہ گھر کے اندر کی کسی پوشیدہ چیز کا ٹھکانا مجھے معلوم ہو سکتا ہے، لیکن ایک بار میں مارکوئیس لورن کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا کہ اسنے کہا میں اپنے دل میں کسی چیز کا خیال کرتا ہوں، بتاؤ وہ کیا ہے۔ میں نے اپنی آنکھ پر پٹی باندھ لی اور مارکوئیس کا ہاتھ پکڑ کے باہر چلا میرے قدم خود بخود اٹھتے جاتے تھے یہانتک کہ میں گھر سے باہر نکلکر اصطبل تک گیا اور وہاں میں نے ایک جاندار چیز پر ہاتھ رکھکر کہا کہ آپ نے اس چیز کا تصور کیا تھا جس کی اسنے تصدیق کی۔ میں نے آنکھ سے پٹی کھولی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک ہرنی تھی۔

اسی طرح ایک مرتبہ آسٹریا کے ولی عہد نے ایک ایسے سیاہ کتے کا تصور کیا جس کا علم خود اس کو بھی نہ تھا، لیکن کمبرلینڈ اس کا ہاتھ پکڑ کر لے چلا یہانتک کہ ایک بازار میں اس طرح کا کتا نظر آگیا جسے ولیعہد نے خرید لیا۔ ایک مرتبہ امتحاناً چند لوگوں نے ایک سوئی کہیں چھپا دی لیکن کمبرلینڈ نے اسے بھی ڈھونڈھ نکالا۔

ایک مرتبہ ایک انڈا سفیر امریکہ کو دیا گیا کہ جہاں چاہے اسے چھپا دے چنانچہ اس نے چھپا دیا۔ اس مرتبہ یہ کیا گیا کہ ایک باریک

زنجیر کا ایک سرا کمبرلینڈ کے داہنے ہاتھ میں باندھ دیا گیا اور دوسرا سفیر امریکہ کے بائیں ہاتھ میں۔ کمبرلینڈ آگے اور سفیر اس کے پیچھے پیچھے تھا، آخر کار یہ اصطبل میں پہونچا اور وہاں ایک صندوق کے پاس ٹھہر گیا جو مقفل تھا، کمبرلینڈ نے سفیر کی جیب سے کنجی نکال کر اس کو کھولا اور انڈا نکال لیا۔

ایک مرتبہ کئی آدمیوں نے ملکر کمبرلینڈ کو دھوکا دینا چاہا یعنی انہوں نے یہ ترکیب کی کہ اس کو باہر کر کے اندر دو قزاقوں اور ایک مسافر کی نقل کی اس طرح کہ دو نے قزاق بنکر تیسرے شخص کو جو مسافر بنا تھا گرفتار کیا، اسکا مال چھینا، خنجر سے اسے ذبح کیا اور پھر خنجر کو صاف کر کے رکھ لیا۔ کمبرلینڈ جب اندر آیا تو اس نے اسی طرح تمام نقل کر کے دکھا دی یہانتک کہ خنجر تک اس نے بالکل اسی طرح صاف کیا، جس طرح ان لوگوں نے کیا تھا۔

ایک مرتبہ انگلستان کے مشہور وزیر گلیڈسٹون نے ایک عدد تین ہندسوں کا اپنے جی میں لیا اور اس کے دو ہندسے ۳ اور ۶ بتا کر کہا کہ تیسرا ہندسہ بتاؤ۔ کمبرلینڈ نے گلیڈسٹون سے کہا کہ اس عدد پر کامل غور کیجئے، اس کے بعد کمبرلینڈ نے بتا دیا کہ وہ عدد ۳۶۶ ہے، لیکن اس کے ساتھ گلیڈسٹون سے یہ بھی دریافت کیا کہ آپ تیسرے ہندسے کے لئے ۵ اور ۶ کے درمیان کیوں تذبذب کر رہے تھے گلیڈسٹون نے اسکا اقرار کیا اور کہا کہ بیشک میں یہ تردد کر رہا تھا۔

الغرض اس قسم کے متعدد واقعات کمبرلینڈ نے قلمبند کئے ہیں اور اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوت اس میں بالکل فطری ہے، جس میں اکتساب کو بہت کم دخل ہے۔ خود یہاں ہندوستان میں ایک بار میں نے ایک گمنام ہندو شخص کو دیکھا تھا جو بند خط کی عبارت کی عبارت پڑھ دیتا تھا۔ میں نے اس سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ اس میں بھی یہ قوت بالکل عطیۂ فطرت تھی۔

اب ایک محقق کے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے اور دماغ کی وہ کونسی ساخت ہے جو ایک شخص میں یہ غیر معمولی ملکہ پیدا کر دیتی ہے، لیکن اسوقت تک اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی اور کسی قسم کی تسکین بخش علمی توجیہ اس کی نہیں ہو سکی۔ ممکن ہے کہ آئندہ اس میں کامیابی حاصل ہو لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت تک اور جدید غوامض فطرت رونما ہو کر انسان کو پھر اسی احساس بیچارگی کے سوگ میں مبتلا نہ کر دیں گے۔

انسان کو فطرت نے کبھی اس پر مجبور نہیں کیا کہ وہ ہر نامعلوم شئے کو معلوم کرے بلکہ اس کا اقتضاء یہ ہے کہ جو معلوم ہو اس سے کام لیا جائے۔ اگر اس طرح کے دماغ دنیا میں موجود ہیں جن سے ایسے غیر معمولی افعال کا ارتکاب ہوتا ہے تو وہ زیادہ قابل اعتنا نہیں بلکہ قابل لحاظ وہ معمولی دماغ ہیں جن کی کاوشیں ہماری روز کی زندگی اور تمدن کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔

آج تک کبھی کوئی قوم کمبرلینڈ، ہوڈینی، یا کسی صاحب کرامات ولی کے خوارق عادات سے ترقی نہیں کر سکی، اگر ترقی ہوئی ہے تو صرف اس معمولی اصول کی بنا پر کہ زمین میں ہل کیسے چلایا جاتا ہے، پتھر ہتھوڑے سے کیونکر توڑا جاتا ہے، روئی کا تاگا اور تاگے کا کپڑا کس طرح بنایا جاتا ہے، اس لئے میری رائے ہے کہ اگر کوئی اگر کوئی ایسا آدمی نظر آجائے جو اس طرح کی باتیں بتاتا ہے یا اس سے ایسی غیر معمولی عجیب باتیں ظاہر ہوتی ہوں، تو اس کی طرف توجہ نہ کر دکیونکہ وہ ایک تعجب انگیز منظر قدرت تو ضرور ہے، لیکن ہماری

دنیاوی زندگی کے لئے اسکا وجود بالکل بیکار ہے۔ انبیاء و رسلؑ نے بھی دنیا میں کوئی کامیابی معجزوں کے ذریعہ سے حاصل نہیں کی اور نہ معجزہ و کرامات ہمارے لئے مفید ہیں۔ بلکہ کامیابی کا اصل راز قوت عمل اور عزم راسخ ہے، سو اس کا استعمال آسمان سے تارے توڑ کر لانے کے لئے نہ ہونا چاہئے بلکہ صرف اپنے کو صحیح بنانے کے لئے ہونا چاہئے۔ غیب کی باتوں کا معلوم ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ واردات حال کو سمجھنا لازم ہے، کیونکہ زمانہ مستقبل کی ہر چیز کو ایک نہ ایک دن حال ہو جانا ہے اور حال کا ماضی ہو جانا بالکل یقینی جس پر انسان کا کوئی قابو نہیں۔

نیاز

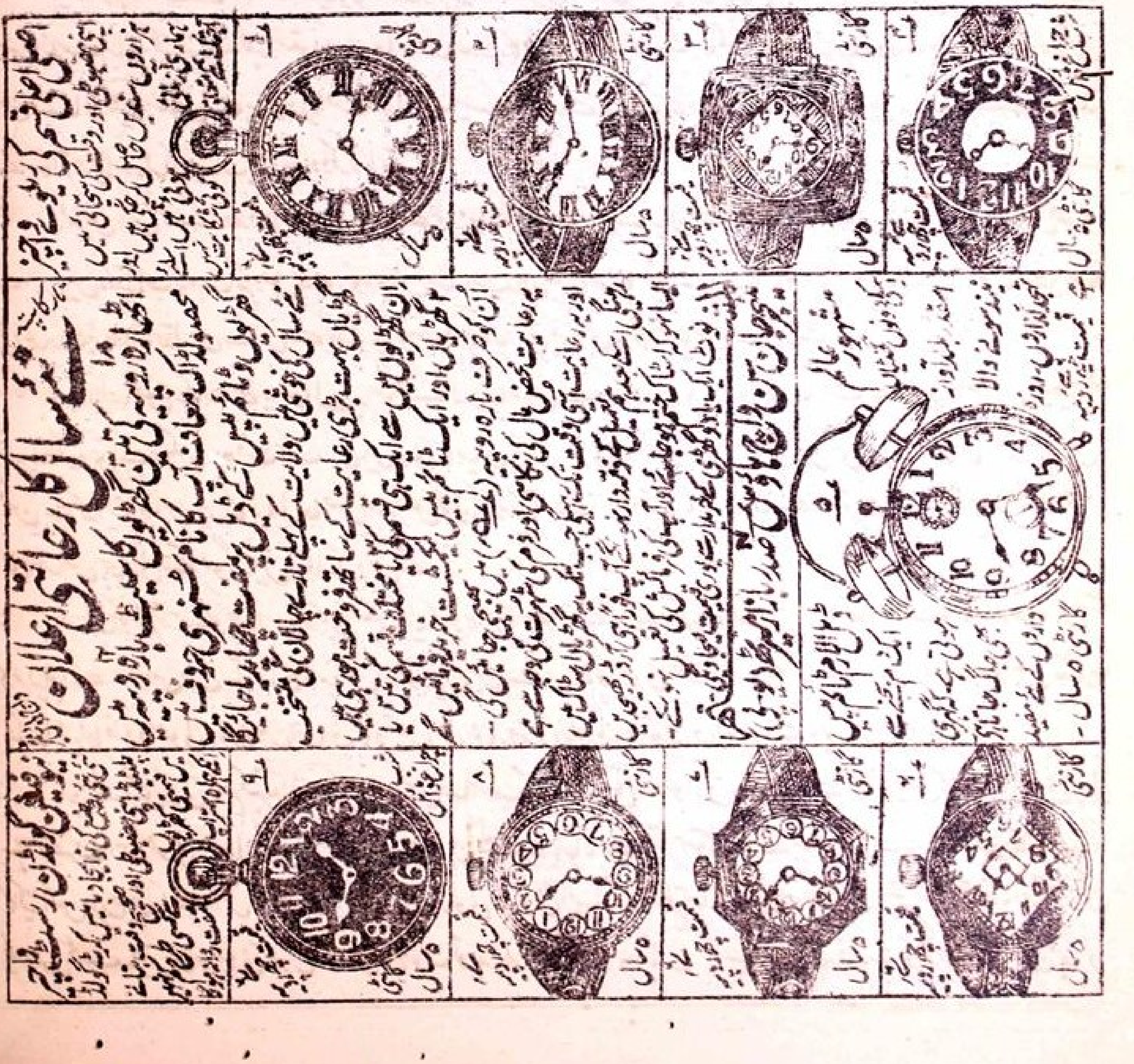

لفظ حسین کے ساتھ امامت کی نسبت احترام و عزت کا غلط معیار ہے

نگار کی کسی گذشتہ اشاعت میں، بہ سلسلہ "باب الاستفسار" میں نے جناب سکینہ بنت حسین کے مسئلۂ ازدواج اور انکی بعض خصوصیات فطرت کے متعلق کچھ لکھا تھا جس کو ہمارے شیعہ احباب نے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا اور بعض نے مجھے متنبہ کرتے ہوئے اسقدر عجیب و غریب ذہنیت کا اظہار کیا کہ میں یہ چند سطریں لکھنے پر مجبور ہو گیا، انکی اصلاح کے لئے نہیں بلکہ صرف اپنا مقصود ظاہر کرنے کے لئے۔

اعتراض کرنے والوں میں صرف ایک صاحب میرٹھ کے ایسے تھے جنہوں نے یہ لکھا کہ جناب سکینہ کے جو حالات میں نے قلمبند کئے ہیں وہ تاریخی نقطۂ نظر سے بالکل غلط ہیں، (حالانکہ انہوں نے بھی تاریخ سے مدد لیکر میرے تحریر کردہ حالات کی تردید نہیں کی اور نہ خود صحیح حالات تحریر فرمائے)، باقی جتنے حضرات تھے انہوں نے اپنی برہمی کا اظہار جس انداز سے کیا وہ نہایت ہی پر لطف ہے۔ مثلاً ایک صاحب نے جوادھ کے ضلع کے معزز وکیل ہیں تحریر فرمایا کہ "چونکہ نگار میں شرر کی تصنیف سکینہ بنت حسین کا اشتہار درج ہوتا ہے اس لئے آئندہ سے نگار کی خریداری منظور نہیں ہے"۔ ایک اور بزرگ نے مطالبہ کیا کہ "لفظ حسین کے بعد چونکہ آپ علیہ السلام نہیں لکھتے اس لئے نگار نہ بھیجا جائے"۔ الغرض اسی طرح کے مطالبات تھے اور اسی انداز کی برہمی تھی جو شیعہ حضرات کی طرف سے ظاہر کی گئی۔ چونکہ میرا مسلک تفریق و تعیین مذاہب سے بہت بلند ہے اور میں ایک شیعہ کیا معنی، ایک بُت پرست کو بھی برا نہیں کہتا اور نہ اسکی طرف سے مذہبی عناد رکھتا ہوں، جیسا کہ نگار کے مطالعہ کرنے والوں پر واضح ہے، اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اپنے برہم ہو جانے والے شیعہ دوستوں سے اس باب میں تھوڑی سی گفتگو کر لوں۔

جناب سکینہ کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے، وہ اپنی نزدیک انتہائی وثوق کے ساتھ لکھا ہے اور اگر کوئی صاحب تاریخ سے اسکی تردید کر دیں گے تو میں بلا تامل تسلیم کر لوں گا۔ علاوہ اس کے میں نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے جسے جناب سکینہ کی شان کے منافی سمجھا جائے۔ شاعری یا موسیقی کا ذوق، وضع و ملبوس کے باب میں انکا اظہار خوش سلیقگی میرے نزدیک ایک عورت کی بہترین صفت ہے اگر اسکا استعمال اچھا کیا جائے اور یقیناً جناب سکینہ کے لئے یہ امر کم باعث امتیاز نہیں کہ آپ کی زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جو انسان کی بلند ترین فطرت کے معیار سے گرا ہوا ہو۔ پھر اگر اس اعتراف کیساتھ ساتھ میں نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ آپ کا ادبی ذوق نہایت پاکیزہ تھا یا موسیقی سے آپکو خاص مناسبت تھی یا یہ کہ آپ نہایت خوش سلیقہ تھیں، تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے جناب سکینہ کی کیا توہین ہوتی ہے۔ اگر اس سارے الزام کے جواب میں یہ عرض کر دوں کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو خود ایک شیعی مورخ (صاحب آغانی) نے تحریر کیا ہے، تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرات شیعہ اس کتاب کو بھی اسی سلوک کا مستحق سمجھیں گے جو نگار کے لئے روا رکھا گیا یا نہیں؟

بہر حال جہانتک روایات تاریخی تعلق ہے میں نے ہر اس عزت و احترام کا لحاظ رکھتے ہوئے اقتباس کیا ہے جسکی جناب سکینہ مستحق ہیں " اور اگر مجھسے اسمیں کچھ غلطی ہوئی ہے تو ہر وقت اسکے اعتراف پر آمادہ ہوں لیکن یہ قیامت تک ماننے کیلئے تیار نہیں کہ اس کی تہ میں میری عصبیت کام کر رہی تھی یا قصداً میں نے دل آزاری کی

اب رہا سوال لفظ حسینؑ کے بعد علیہ السلام یا اس سے قبل لفظ امام کا اضافہ۔ اسمیں البتہ میرا مسلک ذرا عام روش سے علیحدہ ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ انسان جسقدر زیادہ بلند و ممتاز ہوتا جاتا ہے، اسی قدر کمی ان القاب و خطابات میں بھی ہوتی جاتی ہے جو محض تخصیص و تعیین کیلئے وضع کئے جاتے ہیں۔ اور اگر انکو قایم رکھا جائے تو گویا حقیقی عزت میں کمی کرنا ہے۔ حسین کی امامت مسلم ہے اور یہ بھی الیقین ہے کہ وہ سلام و صلواۃ کے مستحق ہیں، لیکن اگر گمان یہ ہو کہ جبتک انکے نام کیساتھ اسکا اظہار نہ کیا جائیگا لوگ نہیں سمجھ سکیں گے تو میرے خیال میں یہ حسین کی اہمیت کو کم کرنا ہے نہ کہ بڑھانا۔ حسین یعنی ان تمام خصوصیات کیساتھ جسمیں امامت و سیادت وغیرہ شامل ہیں دنیا میں صرف ایک ہی ہوا ہے اور جو چیز دنیا میں صرف ایک ہو اور اسکا کوئی مثیل و نظیر نہ ہو اسکے نام کے ساتھ الفاظ تخصیص کا اضافہ فعل عبث ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ صرف حسین کہکر ہم جس قوت کے ساتھ انکی بزرگی کو ثابت کر سکتے ہیں، وہ نہ لفظ امام کے بڑھانے سے پیدا ہوتی ہے نہ کسی اور لقب کے اضافہ سے۔ اگر ایسا ہوتا تو آج لفظ خدا سے زیادہ کسی اور لفظ کے ساتھ طومار ضمیموں کا نہ ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ خدا کی ذات بے نیاز ہے اور اس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں، تو میں پوچھتا ہوں کہ حسین ہی کو کب ضرورت ہے کہ آپ انہیں امام کہیں اور علیہ الصلواۃ والسلام کے دعاؤں کا محتاج سمجھیں۔ نہ وہ کسی کے کہنے سے امام ہو سکتے ہیں، اور نہ آپ کا سلامتی کی دعا ان کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔

البتہ اگر اس کے جواب میں کسی نے یہ کہدیا کہ اس سے مقصود خود برکت و ثواب حاصل کرنا ہے تو بیشک میرے پاس اسکا کوئی توڑ نہ ہوگا اور مجکو پھر سپر ڈالدینی پڑیگی، کیونکہ گفتگو اعتقاد کی اس تاریک دنیا کی چھڑ جائے گی، جہاں ہر جہل کا نام علم ہے اور مجھے اسکا علم ہے کہ بحمد اللہ میں اسقدر جاہل نہیں۔

بہر حال اگر کوئی شخص حسین کے نام کے ساتھ انکے تمام صفات کا اظہار بربنائے غلوئے شوق ضروری سمجھتا ہے تو مجھے اعتراض کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے ضمیر کو تسکین ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ صرف لفظ حسین کا کہدینا زیادہ پر عظمت طریق اظہار ہے تو دوسرے کو برا ماننے کی ضرورت نہیں علی الخصوص اس وقت جب کہ میں عیسیٰ، موسیٰ، محمد، ابوبکر، عمر، عثمان وغیرہ کے ساتھ بھی کسی اور لفظ کا اضافہ نہیں کرتا

اب رہا معاملہ تمر کی کتاب سکینہ بنت حسین کا، سو چونکہ اس کا تعلق صرف تجارت سے ہے اور محض تجارتی نفع کے خیال سے میں کسی کا دل دکھانا پسند نہیں کرتا اس لئے میں نے مینجر کو ہدایت کر دی ہے کہ آیندہ سے اسکا اشتہار بند کر دیا جائے، لیکن جناب سکینہ کے متعلق اپنے لکھے ہوئے واقعات کو میں اس وقت تک غلط نہیں سمجھ سکتا، جب تک اس کی غلطی مجھ پر ثابت نہ کر دی جائے۔

نیاز

نشاط بہار

فریبِ رنگ و بو کہیں   ہوائے جستجو کہیں
فضائے آرزو کہیں   خلائے ماؤ تو کہیں
نزولِ آب جو کہیں   گلوں میں ہے نمو کہیں
نمازِ بے وضو کہیں   ہے خم کہیں سبو کہیں

سرور ہے خمار ہے

بہار ہی بہار ہے

ارم فریب ہے زمیں   مہک رہی ہے یاسمیں
لہک لہک کے پتیاں   ہوئی ہیں کیف آفریں
چہک رہی ہیں بلبلیں   گلاب کے قریں قریں
کنارے پنگھٹوں کے ہیں   حسین و شوخ نازنیں

نشاط ہے ترنگ ہے

امنگ سی امنگ ہے!

بہار سبزہ زار ہے   کہ حسن کیف بار ہے
فضائے کیف زا ہے یہ   کہ لطف بادہ خوار ہے
صبا میں ہیں زمزمے   کہ نغمہ بے قرار ہے
یہ سرخ سرخ پھول ہیں   کہ حسن اشکبار ہے

جو ہے وہ لاجواب ہے

شباب کا شباب ہے

خروشِ سیلِ گنگ ہے   طلسمِ آب و رنگ ہے
صدائے قہقہہ سے اب   گلوئے حسن تنگ ہے
ہر ایک مطربہ لئے!   رباب اور چنگ ہے

غنائے دلپذیر سے   فضا میں خاص رنگ ہے؟

جمال تابدار ہے!

کہ حسن لمعہ بار ہے!

نمائشِ شباب ہے   ہجومِ اضطراب ہے
کھلی ہوئی ہے یاسمن   عروس "بے نقاب" ہے
اسے خبر ہی یہ کہ پھر   کسی کو پیچ و تاب ہے؟
نگاہِ شوق دید سے   مگر وہی حجاب ہے

گناہ پر عذاب ہے

عذاب بھی ثواب ہے

نیاز، سرفروش ہے   تو ناز، لطف کوش ہے
پیامِ شوق میں نہاں   لطافتِ خموش ہے
نگاہِ کیف آفریں   حریفِ بادہ نوش ہے
ردائے جوش میں چھپی   ادائے گل فروش ہے

نمود میں نمود ہے!!

شہود میں شہود ہے!!

لگاوٹیں شباب کی   عداوتیں حجاب کی
چھلک کے قہر ڈھا گئیں   یہ سرخیاں گلاب کی
رلائیں گی مجھے لہو!   یہ شوخیاں نقاب کی
ہنوز لن ترانیاں   سوال پر جواب کی

کلیم ناصبور ہے

خموش کوہِ طور ہے!!

حلاوتِ بہار ہے کہ لطفِ آبشار ہے وہ آئینہ ہوں دہر میں کہ روئے پُرغبار ہے
رفوئے زخمِ دل کہاں کہ جیب تار تار ہے ہے "پیکرِ خموش" یہ کہ حافظِ نزار ہے

متین ہے خموش ہے!
مگر بہار دوش ہے!

حافظ غازی پوری

خدائے محبت سے

اے خالقِ اربابِ وفا چھوڑ نہ مجھکو
اے عشق و محبت کے خدا! چھوڑ نہ مجھکو

اے وہ! کہ شہنشاہ بھی محتاج ہیں تیرے
میں بھی ہوں ترے در کا گدا چھوڑ نہ مجھکو

کمزور ہوئی روح مری۔ دور ہے منزل
ہے کشمکشِ لغزشِ پا چھوڑ نہ مجھکو

ہر ذرّہ گنہگار ہے تعمیر کا میری
لیکن مرے "معصوم خدا" چھوڑ نہ مجھکو

میرے لئے ہے تیرہ و تاریک زمانہ
اے چشمۂ انوار و ضیا! چھوڑ نہ مجھکو

ہوں کب سے تری راہ میں افتادۂ ذلّت
الفت سے مرے سر کو اٹھا چھوڑ نہ مجھکو

یہ ہاتھ تو وابستۂ زنجیرِ وفا ہیں
آقا! مرے دامن نہ چھڑا۔ چھوڑ نہ مجھکو

قطرہ کو بھی دریا سے ہے اک نسبتِ جاوید
ہوں گا نہ کبھی تجھ سے جدا چھوڑ نہ مجھکو

تو میرا خدا ہے تو میں تیرا ہی روشؔ ہوں
اس طرح نہ ہو مجھسے خفا۔ چھوڑ نہ مجھ کو

(روشؔ صدیقی)۔

گونڈے کی یاد دکن میں

تیرے اندر "رودِ موسیٰ"[1] ہے نہ "باغِ عام"[2] ہے
کوئی واقف تک نہیں، تو اس قدر گمنام ہے

اونچے اونچے بام و در والے مکاں تجھ میں نہیں
لکھنؤ کی نو بنو رنگینیاں تجھ میں نہیں

چشمِ ظاہر کے لئے ہر چند تو ویران ہے
پھر بھی تیری سادگی میں بانکپن کی آن ہے

دیکھنے میں یوں تو بے رونق ہے تیری سرزمیں
شہر کہلاتا ہے، لیکن شہریت بالکل نہیں

تیری گلیاں تنگ و ناہموار، سڑکیں خام ہیں
تیرے کچے گھر مسرت کا مگر پیغام ہیں

میری نظروں میں ہیں "رادھاکنڈ"[3] کی وہ سیڑھیاں
چاندنی راتوں میں گھنٹوں میں ٹہلتا تھا جہاں

ہلکی ہلکی چاندنی میں وہ ہوائے مشکبار
وہ کنول کے سرخ پھولوں پر قیامت کا نکھار

کوکتی تھیں کوئلیں جب دکھ بھری آواز سے
دل تڑپ اٹھتا تھا سینہ میں عجب انداز سے

دور آموں کے درختوں پر پپیہا بول اٹھا
یا لبِ صحرا کوئی دہقاں اگر گانے لگا!

درد بن جاتی تھیں آوازیں دلِ مہجور میں!
تیرنے لگتی تھی میری روح موجِ نور میں!!

آم کی فصلوں میں وہ گنجان باغوں کی بہار
وہ سڑک پر دونوں جانب سبز نیموں کی قطار

ہم جلیسوں میں وہ بے معنی خوشی کے چہچہے!
عہدِ طفلی کا تبسم، نرم و شیریں قہقہے!

ہائے وہ "ساگر"[4] کی موجیں، "انجمن"[5] کا سبزہ زار
شام کی تازہ ہواؤں میں وہ ٹینس کی بہار

حضرت اصغرؔ کی وہ رنگیں نوائی کے مزے!
بیخودی میں وہ جگرؔ کی خوش ادائی کے مزے!

ہائے اب تک کمسنی کی رنگ رلیاں یاد ہیں
وہ محلے یاد ہیں، وہ تنگ گلیاں یاد ہیں

کوئی موسم ہو، کوئی رت ہو، سحر ہو شام ہو
منزلِ آوارگی ہو، گوشۂ آرام ہو!!!

یہ مناظر دل سے اپنے میں بھلا سکتا نہیں
مجھ کو کیوں ان سے محبت ہے، بتا سکتا نہیں

ذرہ ذرہ اس زمیں کا جلوہ گاہِ ناز ہے
میری اس وابستگی میں ایک گہرا راز ہے

ذوقی

---

[1] حیدر آباد کی ندی [2] حیدر آباد کا ایک خوبصورت باغ [3] گونڈے کا ایک تالاب [4] ایک دوسرا تالاب [5] کلب کا نام

ترانۂ دل

جب راز ہوں سر تا پا — جب ایک معمّا ہوں
پھر بحث ہے لاحاصل — محمل ہوں کہ لیلےٰ ہوں
یہ دیکھ کہ دانا ہوں! — یہ دیکھ کہ بینا ہوں
یہ دیکھ کہ ہوں سب کچھ — مت پوچھ کہ مَیں کیا ہوں؟

مَیں رونقِ محفل ہوں
دل ہوں مَیں ترا دل ہوں

امکاں مری وسعت کا! — نادیدہ و نشنیدہ
یعنی ہوں ابھی تک مَیں — اک فتنۂ خوابیدہ
صد نغمۂ نشنیدہ — صد جلوۂ نادیدہ
جبریل مرا خادم — خالق مرا گرویدہ

میں جوہرِ قابل ہوں
دل ہوں میں ترا دل ہوں

امین حزیں

عورت

حسن کے اور عشق کے جذبات کا — قلزمِ زخار لہراتا ہوا
قاصدِ عشق اور شاہنشاہِ حسن — نامۂ عصمت کی توقیعِ حیا
نیش ہے لیکن مثالِ نوش ہے — برِشِ پیہم۔ برنگِ مومیا
یا شرابِ عشرت و عیش و نشاط — یعنی آدم کا نخستیں مدعا
یا کہ ہے غارت گرِ ہوش و حواس — بادۂ کیف آورِ ایماں ربا
یا کہ ہے گوسالۂ مسلم فریب — سامری کا سحر ہے چلتا ہوا
یا پری جو کسوتِ آدم میں ہے — نور کے سانچے میں ہے یا بت ڈھلا
یا گلِ رنگینِ فردوسِ نظر — یا ترنم حضرتِ داؤد کا
یا حدیثِ غالبِ جادو طراز — یا کہ شعرِ حافظِ معجز نما
یا اچھوتا سا تخیل جو کہ ہو — سرحدِ افکارِ شاعر سے وریٰ
یا کہ یہ قدرت کا گہرا راز ہے — پردۂ حسن و جوانی میں چھپا!

کیا جنونی کہئے مشتِ خاک کو
فتنۂ محشر کہ طوفانِ بلا

فضل حسین۔ تبسم

غزلیات

اثر رامپوری

گھر سے باہر جاتا ہوں جب دلکو وحشت ہوتی ہے
میرے حالِ ابتر سے دنیا کو عبرت ہوتی ہے

دل کو راغب کرنیوالی اچھی صورت ہوتی ہے
جو دلمیں گھر کرتی ہے وہ اچھی سیرت ہوتی ہے

عرضِ حسرت کو یہ سمجھے میری شکایت ہوتی ہے
کہتے ہیں وہ ان باتوں سے ہمکو اذیت ہوتی ہے

دردِ الفت کے میں صدقے دردِ الفت کے قرباں
بڑہتا ہے یہ جتنا دل میں اتنی راحت ہوتی ہے

اے دل رنجِ فرقت میں گھبرانے سے کیا حاصل ہے
راحت بھی ملتی ہے اسکو جسکو مصیبت ہوتی ہے

اُن سے نظر کا ملنا بس اور سمجھ میں آنا تھا
جو دل کو بس میں کرتی ہے کونسی طاقت ہوتی ہے

شکل راحت کیونکر دیکھے کوئی عشق دلبر میں
جب دل بس میں ہوتا ہے راحت کی صورت ہوتی ہے

دیکھ لیا کرتے ہیں اثر ہم سوئے گردوں ایک نظر
رونے دھونے سے فرقت میں جسدم فرصت ہوتی ہے

شوق مرادآبادی

ہوں خاکِ نامُراد - تری رہگذار میں
جو ذرہ اُڑ گیا ہو - ہوا سے غبار میں

ہمت ہے آج دیکھئے! کس جاں نثار میں؟
ایک اک ادا - پکار رہی ہے ہزار میں

یہ تنگنائے دہر کا ہے نقشۂ حیات
گویا پڑا ہوا ہوں کسی انتظار میں

ہے ہر ہوا کے ساتھ جو رقصاں - بگولہ وار
مٹ کر بھی - یہ جنون ہے میرے غبار میں

ہے عاشقوں میں دھوم رکوع و سجود کی
جوہر تڑپ رہے ہیں جو شمشیر یار میں

واللہ - ایک ہی ہے نوید وصال و مرگ
اُف بے بسی - کہ وہ بھی نہیں اختیار میں

پیغامِ وصل - شوق بس اک حدِ عمر ہے
ابتک گذر رہی تھی کسی انتظار میں

اختر شیرانی

کبھی، کاش، رحم کا بھی اثر ملے چشم فتنہ نگاہ میں!
کہ کوئی گدا ہے پڑا ہوا ترے دردِ عشق کی راہ میں!

نہیں یادِ عیش و ملالِ عمرِ گذشتہ کی کوئی داستاں
مگر آہ، چند وہ ساعتیں، جو بسر ہوئی ہیں گناہ میں!

گلۂ ستم کی مجال تو ہے بجا، اس کو میں کیا کروں
یہ جو ایک بجلی سی بیقرار ہے ان کی نیچی نگاہ میں!

جو نظامِ دل نہ بدل سکا، تو مذاقِ دہر کا کیا گلہ؟
وُہی تلخیاں ہیں ثواب میں! وہی لذتیں ہیں گناہ میں!

نہیں عذر، زاہدو! لاکھ مرتبہ جائیں طوفِ حرم کو ہم
مگر ایک شرط ہے میکدہ، نہ ملا کرے ہمیں راہ میں!

بخدا کہ دونوں جہان میں کوئی بھی اس سے بڑھکے مزہ نہ تھا
اگر ایک تلخیٔ انفعال کی حس نہ ہوتی گناہ میں!

دل شاہجہانپوری

کر چکا برباد جب عشق قیامت زا مجھے
دل کے روزن میں نظر آئی تو دنیا مجھے

جب ازل سے حسن کی فطرت ہے خلوت آشنا
تم نے کوئے عشق میں پھر کیوں کیا رسوا مجھے

وہ تغافل کیش، میں صبر آزما، دل باوفا
دے شب وعدہ نہ تو اے زندگی دھوکا مجھے

آپ برگزری ہوئی ہے خود سمجھ لیں اے کلیم
کیا کہوں اس جلوہ گہ میں کیا نظر آیا مجھے

آرزوئے دید، شوقِ وصل، سب خواب و خیال
ہستیٔ موہوم نے دھوکے دیئے کیا کیا مجھے

شدتِ تنویر آخر بن گئی وجہ حجاب!
پردہ اٹھنے پر بھی اک پردہ نظر آیا مجھے

حشر میں عذرِ وفا کا اب نہیں کوئی محل
یاد ہے اے دل کسی کا وعدۂ فردا مجھے

فرخ بنارسی

طریقِ عشق میں لذت کش فنا ہوں میں
مٹا ہوا سا سرِ راہ نقشِ پا ہوں میں

جہانِ عشق میں اک راز ہے مری ہستی
بیان ہو نہ سکے جو وہ مدعا ہوں میں

مذاقِ درد ملا درد آشنا نہ ملا!!
محیطِ دہر میں لب تشنۂ وفا ہوں میں

ہر ایک ذرۂ فطرت ہے گوش بر آواز
سمجھنے والے سمجھتے ہیں وہ صدا ہوں میں

تمام ہستیِ موہوم اک معمہ ہے
خبر نہیں کوئی جس کی وہ مبتدا ہوں میں

ازل سے جو نہیں منت پذیرِ چارہ گری
وہ خوگرِ خلشِ دردِ لادوا ہوں میں

جفائے عشق کی مجبوریاں معاذ اللہ
نہ دیکھ سکتا تھا جو کچھ وہ دیکھتا ہوں میں

نہیں ہے اپنی خبر ہوش ماسوا کیسا
تلاشِ یار میں کچھ ایسا گم ہوا ہوں میں

بڑھی ہے کیفِ محبت سے بیخودی ایسی
کہ اپنا حال اب ایک اک سے پوچھتا ہوں میں

سرابِ وہم بہارِ نمودِ ہستی ہے
یہ سب فریبِ نظر ہے جو دیکھتا ہوں میں

زمانہ چاہیئے تکمیلِ ذوقِ عرفاں کو
ابھی تو اپنی پرستش میں مبتلا ہوں میں

مری حقیقتِ ہستی ہے راز اے فرخ
کوئی سمجھ نہیں سکتا مجھے کہ کیا ہوں میں

راز رامپوری

سرِ نیاز کو کس کس کا آستاں نہ ملا
مگر جہان میں وہی زینتِ جہاں نہ ملا

ذرا سمجھ کے مری حسرتوں کی داد مجھے
نمک ملا جو کبھی تو نمک فشاں نہ ملا

مرے فرائضِ ہستی میں خامشی تو نہ تھی
بقدرِ وسعتِ غم کوئی راز داں نہ ملا

قفس میں کتنی گذاری خبر نہیں لیکن،
چمن میں آکے جو ڈھونڈھا تو آشیاں نہ ملا

حسابِ حسرتِ سجدہ بتائے دیتا ہوں
یہی کہ مجکو کبھی تیرا آستاں نہ ملا

قفس میں فکرِ خور و نوش اور میرے لئے
ہوں جسکی قید میں وہ بھی مزاجداں نہ ملا

عبث ہے شکوۂ فقدانِ آشنا اے راز
جہاں میں جب کوئی تجکو عدوئے جاں نہ ملا

باب الاستفسار

شطرنج - خواب

(جناب مشتاق حسین صاحب. وکیل. لشکر)

(۱) اس سے پیشتر میں نے شطرنج کے بارے میں آپ سے دریافت کیا تھا کہ یہ کس شخص کی ایجاد ہے اور کب اور کہاں ایجاد ہوئی آپ نے جو مختصر سا جواب (پرائوٹ) عنایت فرمایا تھا اس سے تسلی نہیں ہوئی. امید کہ ذریعۂ نگار مفصل جواب مرحمت فرمائیے۔

(۲) خواب کی بنیاد کیا ہے. نیند کی حالت میں اکثر عجیب قسم کے خواب نظر آتے ہیں جنکا وہم و خیال بھی نہیں. اسکے متعلق علماء و اطباء نے کن خیالات کا اظہار کیا ہے اور خواب کی جو تعبیریں بیان کیجاتی ہیں وہ کہاں تک قابل تسلیم ہیں۔

(نگار) مجھے یاد نہیں کہ شطرنج کی بابت میں آپ نے کب دریافت فرمایا اور میں نے کیا جواب دیا تھا. آپ اس مسئلہ میں کیا تفصیل چاہتے ہیں جب کہ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

عام طور پر یہی مشہور ہے کہ مسلمانوں نے یہ کھیل ہندوؤں سے سیکھا اور ہندو ہی اس کے موجد ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ کھیل یونان کے عہد قدیم میں بھی رائج تھا اور اہل یونان فلامیدوس یونانی (Falamedos) کو اسکا موجد کہتے ہیں۔

مشرق کے عہد وسطےٰ میں نرد اور شطرنج دونوں کا رواج تھا اور نہ صرف ہندوستان بلکہ مشرق کے تمام ممالک میں یہ دونوں کھیل کافی رائج ہو چکے تھے، اس لئے گمان غالب یہی ہے کہ مسلمانوں نے اس کو ایران سے حاصل کیا مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ایران میں اسکا رواج ہندوستان سے آیا ہو۔

لفظ شطرنج کی تحقیق میں بعض نے لکھا ہے کہ اس کی اصلیت سنسکرت ہے، لیکن میرے نزدیک یہ لفظ بگڑی ہوئی صورت ہے فارسی کی "شصت رنگ" کی. ممکن ہے کہ وہاں اس زمانہ میں ساٹھ گھروں کی بساط ہوتی ہو اور اسی لئے اس کو "شصت رنگ" کہتے ہوں. یا پھر یہ نام اس لئے وضع کیا گیا ہو کہ اس کھیل میں ہمیشہ مختلف رنگ کے نقشے بنتے ہیں

مسعودی کا بیان ہے کہ ہندوستان کے راجاؤں میں علوم و فنون کا بہت ذوق تھا اور ان کے عہد میں بہت سی باتیں ایجاد ہوئیں اچنانچہ راجہ باہ بود کے عہد میں نرد کا کھیل ایجاد ہوا اور بلہیت کے زمانہ میں شطرنج ایجاد ہوئی، اور اس فن پر ایک کتاب بھی لکھی گئی جس کا نام ترک جنکا تھا. مہرے آدمیوں اور جانوروں کی شکل کے بنائے جاتے تھے. مسعودی کے زمانہ میں یہ کھیل بارہ مہروں سے ہونے لگا تھا، لیکن اس سے قبل

اس کی مختلف صورتیں تھیں۔

البیرونی نے لکھا ہے کہ یہ کھیل ہندوستان میں مختلف طریقوں سے رائج تھا، لیکن سب سے زیادہ عام طریقہ پانسہ کے ذریعہ سے کھیلنے کا تھا مثلاً اگر پانسہ میں ایک اور پانچ آتے تھے تو بادشاہ یا فیل کو چلنا پڑتا تھا، دو میں رُخ کو تین میں گھوڑے کو چلنا پڑتا تھا۔ مُہروں کی مقررہ قیمت ہوتی تھی جن کا اخیر میں شمار ہوتا تھا اور زیادہ قیمت کا مُہرے رکھنے والا کامیاب سمجھا جاتا تھا۔

فردوسی نے بھی شطرنج کا ذکر کیا ہے اور وہ بالکل موجودہ شطرنج کے مطابق ہے یعنی وہی ۶۴ خانوں کی بساط اور وہی درمیان میں شاہ و وزیر اور اس کے داہنے بائیں فیل، گھوڑا، اور رخ کا قایم کیا جانا۔

شطرنج کے واضع کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے کہ اسنے اس کے صلہ میں بادشاہ سے صرف گیہوں یا چاول کی اتنی مقدار طلب کی تھی جو ۶۴ خانوں میں پہلے خانے سے دوچند کے حساب سے آجائے۔ لیکن بعد کو حساب کرنے سے معلوم ہوا کہ ۶۰ خانوں تک اس کی مقدار اتنی ہوجاتی ہے کہ شاہی خزانہ بھی اس کے لئے کافی نہیں ہوسکتا۔ اس کا ذکر صفدی نے کیا ہے اور البیرونی نے بھی اس پر گفتگو کی ہے۔

بہرحال یہ کھیل عہدِ وسطےٰ میں مشرق، مغرب ہر جگہ رائج تھا اور حروب صلیبیہ کے زمانہ میں میدان جنگ کے اندر خیموں میں دونوں فریق اس کو کھیلتے تھے۔ ہارون الرشید کا شارلمین کو تحفہ میں شطرنج کا بھیجنا مشہور تاریخی واقعہ ہے۔

---

(۲) خواب کے متعلق بحث کے دو طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں ایک وہ جس کا تعلق صرف فزیالوجی (عضویات) اور سائکالوجی (نفسیات) سے ہے اور دوسرا مذہبیات سے۔ اول الذکر علوم میں جو مباحث پیش کئے گئے ہیں وہ بہت بسیط و طویل ہیں، لیکن ان کو مختصر الفاظ میں اگر ظاہر کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان علوم میں خواب کا تعلق بالکل دماغ سے رکھا گیا ہے اور اسکی مختلف صورتیں گویا ان نقوش کی مختلف صورتیں ہیں جو دماغ میں پیدا اور محو ہوتے رہتے ہیں۔

اگر آپ نے عضویات کا مطالعہ کیا ہوگا تو معلوم ہوگا کہ انسان کا سر یا جمجمہ چند ہڈیوں سے مرکب ہے۔ جمجمہ کے اندر دماغ انسانی ہے جو بیشمار باریک رگوں اور ریشوں کا مجموعہ ہے، یہیں سے ایک شاخ ریڑھ کی ہڈی میں چلی گئی ہے اور یہیں سے تمام اعضاء انسانی کے اعصاب وعروق منشعب ہوکر پھیلتے ہیں۔ اس لئے دماغ کو مرکز اعصاب کہتے ہیں اور اسی بنا پر ادراک وحس کا مخزن دماغ کو بتایا جاتا ہے۔

جب تک انسان جاگتا رہتا ہے، دماغ مع اپنے تمام نظام عصبی کے متاثر ہوتا رہتا ہے اور اس تاثر کے نقوش اس کے اندر محفوظ ہوجاتے ہیں۔ لیکن یہ نقوش امتداد زمانہ کے ساتھ دھندلے بھی ہوجاتے ہیں اور مٹتے بھی رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم کسی شخص کو بہت دنوں کے بعد دیکھیں تو کبھی زیادہ غور کرنے کے بعد اسکی صورت یاد آتی ہے اور کبھی بالکل نہیں۔

انسان جب سوجاتا ہے تو دماغ کے بعض حصے معطل ہوجاتے ہیں اور بعض حصے کام کرتے رہتے ہیں۔ اور انہیں کام کرنیوالے حصوں کی یہ تمام اعجوبہ نمائیاں ہیں جنھیں خواب یا رؤیا سے تعبیر کرتے ہیں۔ ابھی یہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ انسان جو کچھ دیکھتا یا سنتا ہے اسکے

نقوش دماغ میں محفوظ رہجاتے ہیں، اس لئے سوجانے کے بعد دماغ کے جو حصے کام کرتے رہتے ہیں انکا مشغلہ یہی ہوتا ہے کہ ان نقوش پر نظر ثانی کرتے رہیں، یا ان میں مختلف قسم کی تبدیلیاں کرکے تماشہ دیکھتے رہیں۔ مثلاً اگر ہم نے دن کو بکری کو درخت پر چڑھتے دیکھا ہے، تو بالکل ممکن ہے کہ دماغ بہ حالت نوم اس منظر کو بالکل الٹ کر یوں دکھادے کہ درخت بکری کی پیٹھ پر اگا ہوا ہے، یا اگر دن کو ہم نے ایک پٹاخہ کی آواز سُنی ہے تو رات کو یہ آواز توپوں کی گرج میں تبدیل ہوجائے، یا اگر ہم نے نل سے پانی کو قطرہ قطرہ کرکے ٹپکتے دیکھا ہے تو رات کو دماغ اسے سیلاب اور طوفان کی صورت میں دکھادے۔ پھر دماغ یہی نہیں کرتا کہ حال ہی کے نقوش میں تغیر و تبدل کرکے پیش کرے بلکہ وہ نئے پرانے تمام نقوش کو ملاکر بھی کبھی پیش کرتا ہے اور انسان حیرت کرتا ہے کہ جن باتوں کا وہم و گمان بھی نہ تھا وہ خواب میں نظر آئیں۔ حالانکہ اکثر و بیشتر یہ قدیم نقوش دماغی کی نظر ثانی ہوتی ہے اور انہیں کے تغیر و تبدل اور گڈمڈ ہوجانے سے مختلف صورتیں خواب کی پیدا ہوتی ہیں۔ شیخ بو علی سینا اور امام رازی ان کے شارح نے بھی خواب کی حقیقت یہی بیان کی ہے اور جدید تحقیقات بھی یہی ہے۔ اور اس میں کلام نہیں کہ خواب کا تعلق بالکل انسان کے دماغ سے ہے۔ لیکن مذہبی دنیا میں خواب کی مختلف قسمیں قرار دیکر ایک قسم کا نام بشارت خدا اور فیضان الٰہی رکھا ہے، جو انبیا، اولیا، صلحاء وغیرہ کو حاصل ہوتا ہے اور جو وحی، الہام، القاء کی ایک صورت سمجھا جاتا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اس پر بحث کریں، اس کی تعیین ضروری ہے کہ خواب یا رویا کے اقسام میں واقعی کوئی قسم ایسی بلند ہے یا نہیں جسکی کوئی علمی تاویل بظاہر نہیں ہوسکتی ہے اور جس کو فیضان الٰہی کہا جاسکتا ہے۔ اس کے متعلق لوگوں کے تجربات مختلف ہیں۔ بعض اس کے قایل نہیں ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ رویائے صادقہ کا وجود پایا جاتا ہے۔ اور حقیقت میں رویاء صادقہ سے انکار نہیں ہوسکتا اور بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں، جن میں خواب کے ذریعہ سے آیندہ ہونے والے یا کسی اور جگہ وقوع میں آنے والے حالات کا علم ہوگیا، چونکہ بظاہر اس قسم کے خواب قدیم نقوش دماغی کا نتیجہ نہیں ہوتے اس لئے ان کو انتباہ غیبی کا کہا جاتا ہے اور ملاء اعلیٰ کے عالم ارواح سے اس کو متعلق سمجھا جاتا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اس قسم کے رویاء کا جو نام جی چاہے رکھ لیا جائے، لیکن ہیں وہ ایک ہی علمی اصول کے ماتحت اور نفسیات انسانی کے مسلمات سے انکو علیحدہ نہیں کرسکتے۔ کہا جاتا ہے کہ اکثر نفوس مقدسہ اور بزرگان دین کے خواب سچے ہوتے ہیں اور کوئی نہ کوئی مدعا ضرور ان میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ لیکن رویاء صادقہ کے لئے ہمارے نزدیک بزرگ یا غیر بزرگ کی کوئی قید نہیں لگائی جاسکتی اگر ایک شخص بغیر ولی یا بزرگ ہوئے حالت بیداری میں کوئی پیشین گوئی کرسکتا ہے، کسی کے دل کی چھپی ہوئی بات معلوم کرسکتا ہے، بند خطوط کے اندر کی عبارت پڑھ لیتا ہے (ملاحظہ ہو اس ماہ کے رسالہ میں مضمون "عالم فطرت، ماوراء علم و ادراک")، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ سونے کے بعد اس قسم کے خواب نہ دیکھ سکے، اس لئے میری رائے یہ ہے کہ رویاء صادقہ کا وجود تو یقینی ہے لیکن اس کے لئے خاص دماغ پیدا ہوتے ہیں اور اکتساب دعیٰ کو اس میں مطلق دخل نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی دماغی ساخت ایسی مکمل تو نہ ہو کہ وہ بہ حالت بیداری اس قسم کی صاف صاف طور پر خبریں دے سکے لیکن سونے کے بعد اشارات یا استعارات کی صورت میں اس کے دماغ کو کچھ علم ہوجاتا ہو اور یہی صورت ایک ایسی ہے جس کا تعلق

تعبیر عن الرؤیا سے ہے۔

شیخ بو علی سینا لکھتا ہے کہ جن لوگوں کے نفس کامل ہیں ان کو خواب میں ملاءِ اعلیٰ سے فیضان ہوتا ہے اور وہ فیضان انکے صورِ خیالیہ میں سے کسی صورت میں منتقل ہو کر خواب میں نظر آتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا بیان ہے کہ صرف اس قسم کے خواب قابل تعبیر ہوتے ہیں۔ باقی سب لغو و مہمل ہیں۔

بو علی سینا اور محدث دہلوی کا یہ ارشاد میری رائے سے مختلف نہیں ہے بلکہ ایک ہی ہے صرف بیان اور تعبیر کا فرق ہو تو ہو۔

اس امر کا ثبوت کہ بعض دماغوں کو اشارات کے ذریعہ سے آیندہ کے حالات سے خبردار کیا جاتا ہے۔ سورۂ یوسف سے بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ یوسفؑ کے جس خواب کا ذکر کلام مجید میں ہے وہ اس قسم کا اشاری دکنائی ہے اور غالباً تمام پیغمبروں میں یوسفؑ ہی ایک ایسے پیغمبر تھے جن کا دماغ نہ صرف اس قسم کے خوابوں کے دیکھنے کا اہل تھا بلکہ اس قسم کے خواب سنکر ان کے مفہوم تک پہونچ جانے کی بھی قابلیت ان میں اچھی پائی جاتی تھی۔

پھر چونکہ اس طرح کے دماغ کم پیدا ہوتے ہیں، اس لئے ہر شخص کو اپنے خواب کی تعبیر تلاش کرنا لغو سی بات ہے۔ کیونکہ اکثر و بیشتر خوابوں کی حقیقت امتلاء معدہ، سوءِ ہضم، تاثرات دماغی، مشاہدات روزانہ، فکر و خیال، واہمہ و تصور سے زیادہ نہیں ہوتی اور ان کے لئے تعبیر نامہ کو لیکر بیٹھ جانا مہمل سی بات ہے۔ جب کہ نہ یہ کوئی علم و فن ہے اور نہ صحت کے ساتھ کوئی اصول تعبیر خواب کے منضبط ہو سکتے ہیں۔

آپ کو اگر رؤیا سے بہت دلچسپی ہے اور اس کے متعلق آپ زیادہ بسیط معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو پہلے عضویات و نفسیات کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے اور انکو پڑھ کر خود غور فرمائیے کہ انکے تسلیم کرنے میں کیا قباحتیں اور ہر خواب کو قابل تعبیر سمجھنے یا عالم رؤیا کو کسی اور دنیا سے متعلق سمجھنے میں کیا فواید ہیں۔

عربی میں بعض اچھے رسایل اس موضوع پر شایع ہوئے ہیں، انگریزی میں تو خیر بہت کافی مواد موجود ہے۔ ان دونوں زبانوں کی کتابوں سے آپ مدد لے سکتے ہیں، کئی سال ہوئے اردو میں دار الاشاعت صوفی پنڈی بہاؤ الدین نے ایک رسالہ میرے ایک دوست کا لکھا ہوا شائع کیا تھا جسمیں عربی معلومات سے مدد لیگئی تھی اسکو طلب کر کے ملاحظہ فرمائیے، اسوقت وہ رسالہ میرے پاس نہیں ہے ورنہ میں اسکا نام بھی لکھدیتا۔

تعبیر کی کتابیں جو عام طور سے بازار میں نظر آتی ہیں بالکل لغو و مہمل ہیں اور انپر اعتماد کرنیکے نقصانات کا مجھے پورا علم ہے، کیونکہ میرے بعض احباب ہمیشہ اپنے خوابوں کو رویاءِ صادقہ سمجھکر انہیں تعبیر ناموں سے مدد لیا کرتے تھے، اور ہمیشہ امداد غیبی کے منتظر رہتے تھے، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ غیب نے انکی مدد کی اور نہ زمانہ نے اتنا قیام کیا کہ ان کے کام کرنیکی عمر باقی رہتی، الغرض اس دہم نے انہیں تباہ کر دیا اور وہ اب بالکل بیکار ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر کسی شخص میں رویاءِ صادقہ دیکھنے کی اہلیت موجود ہو تو بھی، تو بھی اسکو قابل لحاظ نہ جاننا چاہئے کیونکہ اسکے خواب دنیا میں ہماری کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ کسی مصیبت سے بچا سکتے ہیں، چہ جائیکہ ہر شخص کا اس خبط میں مبتلا رہنا۔ اگر آپکا انہماک اسطرف زیادہ ہے تو میں آپکو مشورہ دونگا کہ کوشش کر کے اپنے دماغ کو دوسری طرف متوجہ کیجئے اور کبھی اسباب کا کے علم کی کوشش نہ کیجئے جسکا علم آپکو کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتا۔

نیاز

اقتباسات علمیہ

صحافت اور عجائب تلغراف

اخبار مانچسٹر گارڈین کے دفتر میں ایک بالکل جدید قسم کا آلہ تلغراف نصب ہے جو یوروپ و امریکہ کے کسی اخبار کے دفتر میں نہیں پایا جاتا۔ چونکہ اس اخبار کا ایک دفتر لندن میں بھی ہے اس لئے لندن کے دفتر سے مانچسٹر کے دفتر تک ایک خاص تار لگایا گیا ہے جس کے ذریعہ سے آن واحد میں متعدد پیغامات ادھر ادھر آجا سکتے ہیں۔ اس آلہ کے پاس پانچ ٹائپ کی مشینیں رکھی ہوئی ہیں جو لندن سے آنیوالی خبروں کو از خود ٹائپ کرتی رہتی ہیں۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ لندن کے دفتر میں بھی پانچ ٹائپ کی مشینیں ہیں جن پر کلرک مختلف خبروں کو ٹائپ کرتے ہیں اور انکو دفعتہً اسی ایک تار کے ذریعہ سے مانچسٹر روانہ کرتے ہیں۔ مانچسٹر میں یہ مختلف پیغامات ایک آلہ کے ذریعہ سے علیحدہ علیحدہ ہوجاتے ہیں اور مختلف مشینوں پر پہونچکر ٹائپ ہوجاتے ہیں۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی پیغام جاسکتا ہے، لیکن اس تار کی خصوصیت یہ ہے کہ وقت واحد میں متعدد پیغامات بھیجے جاسکتے ہیں۔

روشنی اور سانپ کا زہر

مشہور ہے کہ صحرا کے رہنے والے سانپوں میں زیادہ مہلک زہر ہوتا ہے۔ اس شہرت کی بنا پر فرانس کی اکاڈیمی کے دو عالموں کا خیال اس طرف منتقل ہوا کہ ممکن ہے اسکا تعلق آفتاب کی سے ہو، چنانچہ انہوں نے اس کے تجربات شروع کئے اور تحقیق کے بعد دریافت ہوا کہ مافوق البنفشی شعاعوں کا اثر سانپ کے زہر کو زیادہ سریع الاثر اور مہلک بنا دیتا ہے۔ ایک ہی سانپ کا زہر دو جگہ تقسیم کرکے ایک پر یہ شعاعیں ڈالی گئیں اور دوسرے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا، اور پھر ان دونوں زہر کو دو جانوروں کے جسم میں پہونچایا گیا تو اس زہر کا فعل بہت شدید ثابت ہوا جس پر شعاعیں ڈالی گئی تھیں۔

یہ بھی قدرت خداوندی ہے کہ وہی مافوق البنفسجی شعاعیں، جو نشو و نما اور ازالہ مرض کے لئے اسقدر ضروری ہیں، وہی سمیت بھی پیدا کرتی ہیں، یعنی اگر ایکطرف وہ تریاق ہیں تو دوسری طرف سم قاتل بھی ہیں۔

مستقبل کا تمدن

جرمنی کی ایک فلم کمپنی نے فلم طیار کیا ہے جس کے ذریعہ سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ آئندہ دنیا کی آبادی اور اسکے شہروں کی کیا حالت ہوگی۔ اس فلم کا نام "مٹروپولس" ہے اس میں دکھایا گیا ہے کہ اس قرن کے اخیر تک مکان اتنے بلند بننے لگیں گے کہ حال کی بلند عمارتیں ان کے سامنے کوئی حقیقت نہ رکھیں گی۔ ان مکانوں کے درمیان سلسلہ آمد و رفت چھوٹے چھوٹے ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے ہوا کریگا، اور ان کی کثرت اس قدر ہوجائے گی جیسے اب سڑکوں پر موٹریں نظر آتی ہیں۔ سڑکیں پلوں کیطرح بالکل معلق بنیں گی، صنعت و حرفت کے کارخانے صرف ایک شخص کی ملکیت میں ہوا کریں گے، اور تمام کام صرف بجلی کا بٹن دبانے سے ہوجایا کریں گے۔ تفریح کے لئے باغ اور پارک بھی معلق ہونگے۔ الغرض شہر کا شہر بالکل میکانکی اور مشین کا بنا ہوا ہوگا جس میں تمام کام بجلی اور مشین سے اس طرح ہوا کریں گے جیسے نظام عالم کے موسموں کا ظہور، آفتاب کا طلوع و غروب اور تمام حوادث طبیعی سب ایک وقت

سترہ برا نپے آپ ہوتے رہتے ہیں اور کوئی ہاتھ اس نظام کو عمل میں لانے والا نظر نہیں آتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس فلم بنانے کا خیال سر فلپ گبس کی کتاب کو دیکھ کر پیدا ہوا جس میں علمی طریقہ سے بتایا ہے کہ دنیا کا عہد مستقبل کسقدر عجیب و غریب آنے والا ہے، ممکن ہے کہ اس وقت یہ پیشین گوئیاں صرف لطایف سمجھی جائیں، لیکن اگر میکانکی ترقی کا یہی عالم ہے تو ہکو حیرت نکرنا چاہیئے، کیونکہ اسوقت جو کچھ نظر آرہا ہے، اگر پچاس سال قبل اسی کی پیشین گوئی کی جاتی تو لوگ اسپر بھی ہنستے، حالانکہ اب وہ سب حقیقتیں ہیں۔

فن پرواز کیلئے ایک جدید اختراع

ڈٹرائٹ امریکہ کا وہ مقام ہے جہاں فورڈ کا کارخانہ ہے اور جس میں اب موٹروں کے علاوہ ہوائی جہاز بھی طیار ہوتے ہیں۔ یہاں ہوائی جہاز کے لئے ایک ایسی جدید اختراع ہوئی ہے جس سے فن طیران میں بہت کچھ انقلاب و تغیر کی توقع کی جاتی ہے۔ یہ اختراع متعلق ہے جہاز کے محرک (موٹر) سے جو بجائے بنزین کے کہربائی مقناطیسی قوت سے چلیگا اور اس کی حرکت زمین کی طرح ہوگی۔

ماہرین فن نے اس اختراع کا امتحان کرنے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ یہ آلہ ایک منٹ میں ۸۰۰ مرتبہ گردش کرتا ہے اور دو ہزار گھنٹے تک برابر بغیر دوبارہ قوت پہونچائے ہوئے یہ آلہ گردش کرسکتا ہے۔

ایک جماعت ماہرین فن کی طلب کی گئی ہے تاکہ اس کی کامل تحقیق کرکے رپورٹ پیش کرے۔ اور دنیا نہایت بیتابی سے نتیجہ کی منتظر ہے۔

مطبوعاتِ جدیدہ

تاریخ اسلام

صدیق بکڈپو لکھنؤ نے حال ہی میں یہ کتاب ۵ جلدوں میں شایع کی ہے۔ کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ ترجمہ ہے مصری مورخ علامہ محی الدین کی کتاب کا اور اسمیں شک نہیں کہ ترجمہ اچھا کیا گیا ہے۔ اس وقت عربی زبان میں یہ تاریخ خاص اہمیت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور اکثر جگہ نصاب میں داخل ہے۔ یورپین ممالک کے اخبار و رسایل نے بھی اس تالیف کی بہت تعریف کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جمع واقعات اور اسلوب بیان کے لحاظ سے یہ کتاب ہر تعریف کی مستحق ہے پہلے حصہ میں فن تاریخ کی اہمیت بیان کرکے عہد نبوی سے بحث کی گئی ہے، دوسرے حصہ میں خلفائے راشدین کے حالات ہیں، تیسرے حصہ میں خلافت بنی امیہ کی تاریخ ہے، چوتھے حصہ میں خلافت عباسیہ کے حالات قلمبند کئے ہیں اور پانچویں میں اسپین اور دوسری اسلامی حکومتوں سے بحث کی ہے۔ کتابت و طباعت پسندیدہ ہے، پانچوں حصوں کی قیمت پانچ روپیہ ہے اور منیجر نگار سے مل سکتی ہے۔

سیر المصنفین جلد دوم

مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی۔ اے نے سیر المصنفین کی پہلی جلد لکھکر اسقدر شہرت حاصل کرلی تھی کہ اگر وہ سیر المصنفین کی دوسری جلد نہ مرتب کرتے تو بعض حضرات کے نزدیک ان پر ناشکر گزاری کا الزام عاید ہو سکتا، لیکن اگر تنقید صحیح کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے

تو میں یہ کہونگا کہ جس طرح پہلی جلد انکا کوئی قابل فخر کارنامہ نہیں تھا، اسی طرح افسوس ہے کہ دوسری جلد بھی ایک ناکامیاب سعی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ پہلی جلد میں انہوں نے دو دوروں سے بحث کی تھی، پہلا وہ جسے انہوں نے میر محمد عطا حسین خاں صاحب تحسین سے شروع کرکے محمد خلیل اللہ خاں اشک پر ختم کیا تھا۔ اور اس سلسلہ میں میر لطف علی، میر بہادر علی حسینی، میر امن دہلوی، میر شیر علی افسوس، سید انشاء اللہ خاں انشار، مولوی شاہ رفیع الدین دہلوی، مولوی شاہ عبدالقادر دہلوی، مولوی اسمٰعیل شہید، منشی نہال چند لاہوری وغیرہ کے حالات اور لٹریچر سے بحث کی تھی، دوسرے دور کو فقیر محمد خاں گویا سے شروع کرکے منشی امیر احمد مینائی پر ختم کیا تھا اور اس سلسلہ میں مرزا رجب علی بیگ، اسد اللہ خاں غالب، غلام امام شہید، غلام غوث بیخبر وغیرہ کے تذکرہ سے اعتنا سے کیا گیا تھا۔ اب یہ دوسری جلد تیسرے دور سے متعلق ہے جس میں سرسید، مولوی چراغ علی، محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ، سید علی بلگرامی، ڈپٹی نذیر احمد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، رتن ناتھ سرشار اور شرر شامل ہیں۔

شکر ہے کہ چوتھا دور "شایان دست دبازو قاتل" نہیں سمجھا گیا ورنہ وہ بھی اسی تنقید عالیہ اور صحت ذوق کا شکار ہوتا جو انہوں نے گذشتہ تین ادوار کے حالات قلمبند کرنے میں صرف فرمائی ہے۔ تنہا صاحب نے یقیناً اپنے آپ کو سمجھنے میں بہت بڑی غلطی کی ورنہ وہ ہرگز سیر المصنفین ایسی اہم کتاب کی تالیف کی جرات نہ کرتے، اگر سیر المصنفین سے انکا مقصود یہ تھا کہ بعض مصنفین کے حالات نہایت سرسری طور پر یکجا کرکے انکی تصانیف پر ایک غیر ماہرانہ رائے کا اظہار کردیا جائے تو بیشک تنہا صاحب کو کامیاب مولفین کی صف میں جگہ دیجاسکتی ہے، لیکن اگر سیر المصنفین کے ذریعہ سے کوئی ایسی تالیف پیش کرنا مقصود تھا جو تذکرہ نویسی، سیرت نگاری، مورخانہ کاوش و تحقیق، تنقید صحیح، فلسفیانہ استنتاج تاریخ کی معیاری چیز ہو، تو ہر شخص ادنیٰ تامل کے بعد کہدیگا کہ تنہا صاحب اس میدان کے مرد نہ تھے اور اگر وہ اتنا وقت اپنے پیشۂ وکالت ہی کی ترقی میں صرف کرتے تو ذریعہ موزوں تھا۔

جمع واقعات و حالات میں انہوں نے سوائے چند رسائل یا مشہور کتب تذکرہ و تاریخ کے اور کوئی دوسری صورت استفادہ کی اختیار ہی نہیں کی اور تنقید کی حقیقت اس سے ظاہر ہے کہ شرر کے ناولوں میں وہ فردوس بریں کو سب سے بہتر ناول خیال کرتے ہیں (جو حقیقتاً سب سے بدتر ہے) اور محمد حسین آزاد کی زبان کو ٹکسالی کہتے ہیں، جو اغلاط سے پُر ہے۔ فاضل مولف نے اقتباسات کی کثرت سے اس جلد کو بھی بہت ضخیم بنانے کی کوشش کی ہے، لیکن افسوس ہے کہ اقتباسات بھی سب ادنیٰ قسم کے ہیں اور کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہوسکے کہ تنہا صاحب کا دماغ کبھی بھول کر بھی حقیقت کی طرف مائل ہوسکتا ہے۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ جامعہ ملیہ دہلی نے اس کتاب کو شایع کرکے کوئی خاص خدمت اردو زبان یا فن تذکرہ نویسی کی انجام دی ہے۔

اس کتاب کی قیمت تین روپیہ ہے جو حسن طباعت و کتابت اور ضخامت کے لحاظ سے زیادہ نہیں ہے۔

قرآن اور پردہ

مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔ اے (علیگ) نے اس رسالہ میں روایت و درایت دونوں طرح عورتوں کے موجودہ پردہ کو ناجائز و غیر ضروری ثابت کرنے میں اس اجتہاد اور سعی و کاوش سے کام لیا ہے جسکا جدید تعلیمیافتہ حضرات میں فقدان ہے۔ انکی اس تالیف سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب چغتائی ایک اچھے مولف و مصنف ہونیکی اہلیت اپنے اندر رکھتے ہیں اور میرے نزدیک یہ فال نیک ہے کہ انکی یہ اہلیت حسن نسائی کے ساتھ ساتھ بے نقاب ہوئی۔ ہرچند اس لحاظ سے کہ عورتوں کے پردہ کا مسئلہ اس وقت مردوں کے لئے قابل توجہ ہوتا ہے، جب خود عورتوں نے اسکی کراہت کو محسوس کرکے اسکا اعلان کردیا، اس نوع کی سعی کوشش کوئی خاص امتیاز نہیں رکھتی، لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر کسی وقت عورتوں کو خود علمی مقابلہ متعصب قسم کے مردوں سے کرنا پڑا تو ایسی تصانیف ان کیلئے اچھا آلۂ حرب و دفاع ثابت ہونگی۔

شروع میں آنریبل ڈاکٹر جسٹس شاہ محمد سلیمان چیف جسٹس الہ آباد کا مختصر لیکن نہایت مدلل مقدمہ کیا بلکہ فیصلۂ آخری بھی شامل ہے، جو نہ صرف

اس لحاظ سے کہ وہ یوپی کی سب سے بڑی عدالت گاہ کے سب سے بڑے عادل حاکم کا فیصلہ ہے، بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ وہ قوم کا بہترین نباض بھی ہے، بہت زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔

کتاب نہایت عمدہ چھاپی گئی ہے اور ۱۲؍ میں مع محصولڈاک سکریٹری انجمن اصلاح پردہ علیگڈھ سے ملسکتی ہے۔

صراط الحمید

سفرنامہ ہے محمد الیاس برنی ایم۔ اے۔ پروفیسر معاشیات جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد کا جو (مقامات مقدسہ)، شام، فلسطین وحجاز کی زیارات کے سلسلہ میں مرتب کیا گیا ہے۔

جناب برنی نے جس ولولہ وشوق، اور جس جذبۂ خلوص وعقیدت سے یہ سفر کیا ہے وہ کتاب کے ہر ہر لفظ سے ظاہر ہے۔ اور غالباً اسی کیفیت کا اثر ہے کہ ایک شخص اس کے مطالعہ سے کافی لطف اندوز ہوتا ہے۔ مقامات مقدسہ کی زیارت کرنے والوں کیلئے یہ سفرنامہ بہترین مشیر وہمدردگی خدمات انجام دے سکتا ہے اور سفر وحضر، قیام ورحلت، خصوصیات اماکن وغیرہ کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس میں درج نہو۔ اگر وہ معاشیات واقتصادیات کے ماتحت بھی ان مقامات پر روشنی ڈالتے تو غالباً بے محل نہوتا، لیکن برنی صاحب کا یہ سفر ایک عاشق سا سفر تھا، نہ کہ پروفیسر کا۔ کتاب کی طباعت وکتابت کی نفاست پر رائے زنی بیکار ہے، کیونکہ مسلم یونیورسٹی پریس میں چھپی ہے اور غالباً وہیں سے ۱۲؍ میں ملسکتی ہے۔

مطلع الانوار

سلسلۂ کلیات خسروی کی یہ ساتویں کتاب ہے جو مولوی محمد مقتدا خانصاحب شروانی کی تنقید ونگرانی میں مسلم یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی ہے۔ اس سے قبل جو حضرات اس سلسلہ کی اور کتابوں (مجنوں لیلیٰ، آئینہ سکندری، لالی عماں، دول رانی خضر خاں، قران السعدین، ہشت بہشت) کو دیکھ چکے ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس مثنوی کو بھی کیسا ہونا چاہئے۔ صحت وحسن کتابت اور تصحیح وتنقید کے لحاظ سے یہ مثنوی بھی خاص اہتمام سے شائع ہوئی ہے اور نواب محمد اسحاق خاں مرحوم جو ادبرکات اپنے بعد چھوڑ گئے ہیں، انمیں میں سے ایک علمی برکت یہ بھی ہے۔

اس سے قبل جو مثنویاں شائع ہوئی ہیں ان میں مولوی مقتدا خانصاحب کی کوششیں محض حسن طباعت تک محدود تھیں، لیکن اسمیں انکا حسن ترتیب وجمال تنقید بھی شامل ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ یہ مثنوی قابل قدر نہو۔ رہا کلام خسرو سو اسکے متعلق لکھنا بیکار ہے کہ ہر شخص اس کی حلاوت سے واقف ہے۔ قیمت لکھی نہیں ہے۔

الایمان

یہ ایک رسالہ ہے ۵۲ صفحات کا جسے مولوی محمد مقتدے خاں شروانی نے مسلمان بچّوں کی تعلیم عقاید کی غرض سے لکھا ہے۔ زبان نہایت صاف وسلیس ہے اور ترتیب معقول۔ ۲؍ آنہ میں مسلم یونیورسٹی پریس سے ملسکتی ہے۔

سفرنامہ شاہ امان اللہ خاں حصۂ اوّل

مولوی زاہد القادر صاحب نے ان تمام واقعات کو جو شاہ افغانستان کی سیاحت یوروپ کے متعلق اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں ایک جگہ جمع کرکے اس نام سے شائع کیا ہے۔ چونکہ یہ حالات کوئی جدید چیز نہیں ہیں اسلئے اسکے متعلق رائے زنی بیکار ہے، البتہ اسقدر جدّت ضرور کیگئی ہے کہ جابجا تصاویر دیکر اسکو زیادہ دلچسپ بنایا گیا ہے، اور شروع میں شاہ امان اللہ خاں کے مختصر حالات بھی دیدیئے گئے ہیں۔ اس حصہ میں سیاحت روس تک کے حالات درج ہیں، باقی حالات دوسرے حصہ میں ہونگے، اسکی قیمت قسم کے لحاظ سے دو روپیہ اور ایک روپیہ رکھی گئی ہے۔ ملنے کا پتہ قریشی بکڈپو کوچہ چیلاں دہلی ہے۔

ابن سعود

یہ ایک ناول ہے جسمیں جناب حسرت لکھنوی نے ابن سعود (سلطان نجد) کے حالات پر فسانہ کے پیرایہ میں روشنی ڈالی ہے۔ اسکے ذریعہ سے بہت سے ایسے راز بھی ابن سعود کے بے نقاب کئے گئے ہیں جنکا علم عوام کو نہیں ہے۔ یہ کتاب گویا اس لٹریچر میں شامل ہے جو ہندوستان کے اندر ابن سعود کے مقابر وآثار شکن پالیسی کے خلاف پیدا ہو گیا ہے۔ اسکی قیمت ۱۲؍ روپیہ رکھی گئی ہے جو ۱۹۲ صفحہ کی کتاب کے لئے زاید ہے۔ ملنے کا پتہ قریشی بکڈپو کوچہ چیلاں دہلی ہے۔

پرتاب ۱۲ر
رد ہمنی ۱۰ر

مولانا شرر مرحوم

جنید بغدادی عہ
ملکۂ زنوبیہ ۳ر
قرۃ العین ۳ر
مخدرات ۸ر
جویائے حق للعہ
لعبت چین عہ
فاتح مفتوح ۸ر
بابک خرمی ۸ر
الفانسو ۱۲ر
ایام عرب ۸ر
قیس و لبنیٰ ۸ر
یوسف و نجمہ ۸ر
زوال بغداد ۸ر
مینا بازار عہ
مقدس نازنین ۸ر
رومتہ الکبریٰ ۸ر
فلپانا ۸ر
غوقین ملکہ عہ
منصور موہنا ۸ر
حسن انجیلنا ۸ر
ملک العزیز ورجنا ۱۲ر
فردوس بریں ۸ر
حسن کا ڈاکو ۸ر
دربار حرام پور ۱۰ر
غیب دان دلہن عہ
بدر النساء کی مصیبت ۸ر

سیرۂ تلخ ۸ر
نیکی کا پھل ۸ر

شوق قدوائی مرحوم

ترانۂ شوق ۸ر
قاسم و زہرہ عہ
نیرنگ جمال ۸ر

میر ولی اللہ بی اے

بندگی ۶ر
کاس الکرام ۸ر
لسان الغیب جلد اول ۸ر
" دوم ۶ر
" سوم ۶ر
" چہارم ۶ر
نمکدان فصاحت ۸ر
بادۂ ناب عہ

ظفر عمر بی اے

چوروں کا کلب ۹ر
نیلی چھتری ۸ر
بہرام کی گرفتاری عہ

مولانا نیاز فتحپوری

گہوارۂ تمدن ۶ر
نگارستان ۶ر
صحابیات ۶ر
تاریخ الدولتین ۸ر

سید سجاد حیدر بی اے

زہرا ۱۳ر
جلال الدین خوارزم شاہ ۸ر
خیالستان ۸ر
ثالث بخیر ۸ر

حکایات و احتسابات ۸ر

دلچسپ تاریخی و جاسوسی ناول

سراب عیش ۸ر
بالشوک شہزادی ۸ر
شہید وفا ۸ر
ممتاز بیگم ۸ر
شعلۂ رنگین ۸ر
محاصرۂ پیرس ۸ر
شیخ چلی ۸ر
بہادر ترک ۸ر
بہرام کی واپسی ۸ر
انقلاب فرانس ۸ر
حسن بنارس ۸ر
نظرتی جاسوس ۸ر
ترکی حرم سرا ۸ر
جنگ طرابلس ۸ر
بہرام چور ۸ر
زرپرست ۸ر
کنجی کا راز ۸ر
عبد الرحمٰن ناصر ۶ر
عروس سحر ۶ر
سیلاب خون ۸ر
کرشمہ ۸ر
وفادار دلہن ۸ر
طوفان زمین ۸ر

سیاحت زمین ۸ر
سیاحت ۸ر
نازنین مراکش ۸ر
سمندر کی سیر ۶ر
اسرار بالشویزم ۸ر
روح لیلیٰ ۸ر
امین بیگ ۸ر
حجاج بن یوسف ۸ر
یوسف پاشا ۸ر
انقلاب عثمانی ۸ر
نیلی چھتری ۸ر
بہرام کی آزادی ۱۲ر
بہرام کی گرفتاری عہ
بہرام کی سرگزشت عہ
پر اسرار قتل ۶ر

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب ۸ر
بزم خیال عہ
مشاطۂ سخن عہ
انشاء النسوان ۶ر
مکاتیب محسن الملک ۸ر
لیلیٰ مجنون ڈراما ۸ر

مراثی

مراثی دبیر ۶ر
مراثی انیس للعہ
مراثی ضمیر عہ

مراثی مونس ۱۲ر
مراثی دلگیر ۱۲ر

تذکرۃ الشعرا

تذکرۂ حسینی ۱۱ر
گلشن ۱۰ر
سراپائے سخن عہ
سوانح نظیر اکبرآبادی عہ

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز ۸ر
کلیات عراقی ۱۲ر
دیوان حافظ ۸ر
دیوان نعمت خان عالی عہ
کلیات انوری ۶ر
دیوان بیدل ۱۰ر
کلیات سعدی ۸ر
دیوان عرفی ۱۲ر
کلیات جامی ۸ر
کلیات غالب ۸ر
کلیات صائب ۱۲ر
کلیات حزین ۶ر
دیوان عنصری ۱۴ر
دیوان ظہیر فاریابی ۶ر
دیوان غنی کشمیری ۶ر
دیوان ناصر علی ۵ر
دیوان ہلالی ۶ر
کلیات جلال اسیر ۸ر

دواوین اردو

دیوان حسن دہلوی ۶ر
کلیات ظفر ۶ر

کلیات مومن عہ
دیوان ناسخ ۸ر
کلیات میر ۸ر
کلیات سودا ۸ر
کلیات انشا ۸ر
کلیات نظیر اکبرآبادی عہ
گلزار داغ ۸ر
دیوان رند ۹ر
دیوان ذوق ۱۲ر
کلیات اسمعیل ۶ر
مرآۃ الغیب ۸ر
صحیفۂ عشق ۶ر
فریاد داغ ۸ر
دیوان قاتل ۸ر
دیوان شہیدی ۸ر

عجائب و غرائب

عجائب المخلوقات تصویر ۸ر
" باتصویر سادہ للعہ
مجمع الفنون ۸ر
طلسم فرنگ ۶ر
کارخانۂ عالم

زنانہ لٹریچر کے ناولوں کے ترجمے

الہ دین دلہن ۸ر
فریب حسن ۶ر
سوزن عشق ۸ر
روز الیمبرٹ للعہ
ناول اسرار ۶ر
شام جوانی ۸ر
طلسمی فانوس ۸ر

نگار بک ایجنسی
نظیر آباد لکھنؤ

تصانیف مولانا نیاز فتحپوری

صحابیات

جس میں عہد سعادت کے ۵۸ خواتین کے مستند حالات درج ہیں۔ اس کا مقدمہ مولانا کی خاص زبان و انشا میں ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت فی جلد ۶ر

نگارستان

مولانا نیاز کے معجزات ادب و انشا کا انتخاب جس میں بعض وہ فسانے و مضامین بھی درج ہیں جو لٹریچر میں غیر فانی درجہ رکھتے ہیں۔

قیمت فی جلد عار

شاعر کا انجام

مولانا نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا ایک افسانہ جس کی ایک ایک لفظ قوت خیال اور زور قلم کا بے مثل نمونہ ہے۔

قیمت فی جلد ۱۰ر

شہاب کی سرگزشت

اردو میں پہلا فسانہ ہے جس میں نفسیاتی تخلیل کے لحاظ سے سیرت نگاری کی گئی ہے۔ یہ امر مسلم ہو چکا ہے کہ اردو میں اس سے بہتر تخیل اور بلند انشا کا فسانہ کوئی شائع نہیں ہوا۔

قیمت فی جلد عہ

جذبات بھاشا

ہندی شاعری میں جو لوچ اور کیفیت ہے اس کا علم انھیں کو ہو سکتا ہے۔ جنھوں نے اس زبان کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کو دیکھئے اور جذبات و خیال کی پاکیزگی کی داد دیجئے۔

قیمت فی جلد ۱۲ر

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان مصری مشہور مورخ اسلام کی تاریخ تمدن اسلامی کے ایک حصہ کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسی تاریخ پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔

قیمت فی جلد عہ

علم فراست الید

یعنی ہات کی لکیروں کو دیکھکر ایک شخص کی سیرت اور اس کے ماضی و مستقبل کے حالات معلوم کرنے کا علم۔ اس فن پر ایک سلسلہ مضامین نگار میں شایع ہوا تھا۔ اب اسے خوبصورت جیبی سائز میں مرتب کیا جا رہا ہے اور آخر دسمبر ۱۹۲۸ء تک شایع ہو جائیگا۔ اس کتاب میں اس فن کے تمام مشکلات اسقدر آسان زبان میں حل کئے گئے ہیں کہ ہر شخص مطالعہ کرنے کے بعد نہایت معمولی مشق سے ہات دیکھکر صحیح احکام صادر کر سکتا ہے قیمت فی جلد عہ

ظریف شاعروں کا تذکرہ

یا

تذکرۂ خندۂ گل

اردو و فارسی کے جتنے ظریف شاعر گزر چکے ہیں یا اب موجود ہیں ان سب کے حالات مع ان کے لطائف و ظرائف اور نمونۂ کلام کے یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب بھی چھپ رہی ہے جو حضرات ابھی سے دو روپیہ بھیجکر اپنا نام درج کرا لیں گے ان سے کوئی زاید قیمت نہ لی جائیگی۔ اشاعت کے بعد اسکی قیمت کا اندازہ للعہ کیا گیا ہے۔

خاک پروانہ

مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند کے افسانوں کا مجموعہ، جن کی شہرت و قبول کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جینی زبان میں بھی اسکے ترجمے ہوئے ہیں

قیمت علاوہ محصول عہ

(منیجر "رسالہ "نگار" نظیر آباد لکھنؤ)